Regd.# MC-1366

دینی، اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا علمبردار

•جلد 15/ •شمارہ 5/ •دسمبر/ 2025

ماہنامہ

فہمِ دین

واقعہ طائف

دستورِ نجات صرف اسلام

زندگی کا سالنامہ

قرآن
محبت کی عجیب داستان

باادب بانصیب

BAITUSSALAM
PUBLICATIONS

91400056741

Baitussalam.org Baitussalam_org Baitussalam_org +9221-111-298-111

BAITUSSALAM

BAITUSSALAM TECH PARK

BAITUSSALAM
—TECH PARK—

بیت السلام ٹیک پارک

فری آئی ٹی کورسز

FREE IT COURSES

WHATSAPP: **+92 333 0189367**

EMAIL: **techpark@baitussalam.org** WEBSITE: **baitussalam.org/tech-park**

ماہ نامہ

فہمِ دین

کراچی

دسمبر 2025ء | جمادی الاخرہ / رجب 1447ھ

فہم وفکر

باادب بانصیب	مدیر کے قلم سے	04

اصلاحی سلسلہ

فہمِ قرآن	شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم	05
فہمِ حدیث	مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ	06
آئینہ زندگی	حضرت مولانا عبد الستار حفظہ اللہ	08

مضامین

علم کی عظمت	عذرا خالد	10
زندگی کا سال نامہ	حفصہ سلطان	12
حضرت بلال رضی اللہ عنہ	دانیال احمد	14
وہی صبح وہی شام	سیدہ ناجیہ شعیب	15
محبتِ قرآن کی عجیب داستان	عمرانہ نعمت اللہ	18
نارنگی کے فوائد	حکیم شمیم احمد	20

خواتینِ اسلام

تربیتِ شوہراں	بنت ایوب	22
چھوٹا لڑکا بڑی سوچ	انیسہ عائش	23
مومنہ	ام محمد سلمان	26
آگے کا سفر	ندا اختر	28
تیسری شے	لائبہ عبد الستار	29
سوشل زہر	مہابہ غازی	30
رشتے ہیں انمول	سعدیہ اجمل	32

باغچہ اطفال

قائد اعظم رحمہ اللہ	حجاب سید	33
چال	مہوش اسد شیخ	34
خاموش محافظ	آمیلیہ فلک	35
گلاب کی مسکان	حفصہ فیصل	36
کرنل شیر خان	عصمت اسامہ	38
بابائے قوم کا فرمان	فاکہہ قمر	38
جناح کا سپاہی	قانتہ رابعہ	39
میری یادوں میں رہتا ہے	شائلہ شکیل	39

بزمِ ادب

واقعہ طائف	حافظہ وسطی چودھری، حافظہ سویرا چودھری	42

اخبار السلام

اخبار السلام	ادارہ	50

زیرِ سرپرستی

حضرت مولانا عبد الستار حفظہ اللہ

مدیر: قاری عبد الرحمن

نظرِ ثانی: طارق محمود

تزئین وآرائش: فیضان الحق شمسی

آراء وتجاویز کے لیے

+92 335 1135011

اشتہارات کے لیے

0314-2981344

marketing@fahmedeen.org

C-26 گراؤنڈ فلور، بن سیٹ کمرشل اسٹریٹ نمبر 2، خیابانِ جامی، بالمقابل بیت السلام مسجد، ڈیفنس فیز 4 کراچی

ناشر: فیصل زبیر | مطبع: واسا پرنٹر | مقامِ اشاعت: دفتر فہم دین

باادب بانصیب

یہ جملہ یقیناً ہم سب نے بارہا سنا، پڑھا، لکھا اور کہا ہوگا: ''باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب'' اور بزرگوں کا یہ مشہورِ عام قول بھی ہم سبھی جانتے ہیں: ''جس کے پاس ادب نہیں، اس کا علم اور عمل دونوں بے فیض ہیں۔'' ادب واحترام دراصل اخلاقی اقدار کی بنیادی اینٹ ہے۔ باادب ہونا ہی دراصل خوش نصیبی اور کامیابی کی ضمانت ہے۔ اسلامی معاشرت کی خوب صورتی کا انحصار اسی اخلاقی جوہر پر ہے۔ اسلام نے ادب واحترام کو صرف ایک سماجی قدر نہیں، بلکہ دین کی روح اور ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے۔''

جانتے بوجھتے اور سمجھ رکھتے ہوئے بھی آج کی نئی نسل اظہارِ رائے کی آزادی میں اس قدر آگے بڑھ چکی ہے کہ بزرگوں، والدین، اساتذہ اور علمی وروحانی شخصیات کا ادب ان کے لیے گویا ایک بوجھ بن گیا ہے، بلکہ دیکھا یہ جارہا ہے کہ احترام کی بجائے تنقید، تمسخر اور کھلی بے ادبی عام ہوتی جارہی ہے اور اس کو اختلافِ رائے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سوشل میڈیا نے اس عادتِ بد کو مزید مہمیز لگائی ہے۔ روز بروز اس بے باکی میں تیزی آتی جارہی ہے۔ یہاں ہر فرد خود کو عقلِ کلُ سمجھتا ہے اور اختلافِ رائے کی آڑ میں اکابر، علما اور بزرگوں پر انگلی اٹھانا فیشن بن گیا ہے اور اس معاملے میں ایک اور رویہ ہمیں مزید گراوٹ کی طرف بہائے لے جارہا ہے اور وہ یہ کہ ہر جماعت اور گروہ نے یہ رویہ کسی بزرگ اور کسی مشہور شخصیت کی آڑ میں اختیار کرر کھا ہے، گویا بزرگ حضرات اور علما کو تقسیم کرلیا گیا ہے، میرے بزرگ اور تیرے بزرگ میرے پیر اور تمہارے پیر میرے علما اور تمہارے علما۔۔۔ یہ اگرچہ زبان سے کہا نہیں جا رہا اور لکھا نہیں جارہا، لیکن عمل کچھ ایسا ہی ہے۔

آج جس کے ہاتھ میں موبائل ہے، وہ اپنی ذاتی سوچ اور خیال کو پیش کرتے ہوئے خود کو مقتدیٰ، دانشور، عالم، صحافی، رہبر و رہ نما سمجھتا ہے اور ہر لکھی کہی چیز سوشل میڈیا پہ شائع اور نشر ہونے کی آزادی نے ایسی کھلی چھوٹ دے دی ہے، جس نے ہر قسم کی بدتمیزی اور نازیبا الفاظ کو عام کردیا ہے اور نوبت گالم گلوچ تک جا پہنچی ہے اور اس کو حق کہنے سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ یہ ادب کا قحط ہے، جہاں گالی کو آزادیِ اظہار کا نام دیا جانے لگا ہے۔

مذہبی معاملات ہوں یا سیاسی اور فکری، اختلافِ رائے ہمیشہ سے موجود رہا ہے، لیکن اس کے اپنے اصول وآداب تھے۔ اب وہ شائستگی مفقود ہے۔ اب تو بات بڑھ کے غلط اندازِ بحث و مباحثہ، شخصی حملوں، لعن طعن اور تہمت تک پہنچ چکی ہے۔ معلومات سطحی ہوں گی، لیکن انداز ایسا موثر اور پُر اعتماد کہ غلط پہ حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ کسی مذہبی عالم یا سیاسی و معاشی رہنما سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن اس کی توہین وتذلیل، اسلامی تعلیمات کے بالکل منافی ہے۔ یہ زوال صرف معاشرتی نہیں، بلکہ ایمانی ہے۔ بے ادبی اور اخلاقی پستی انسان کو دنیا میں ذلت اور آخرت میں سخت مؤاخذے کی طرف لے جاتی ہے۔

نجات اور کامیابی صرف ادب کے راستے میں ہے۔ آج ہمیں اپنے گھروں، مدارس سمیت تعلیمی اداروں، بلکہ خانقاہوں میں ادب واحترام کو دوبارہ لانا ہوگا۔ اپنے بچوں اور شاگردوں کو سمجھانا ہوگا اور ان کی زندگی کو اس رخ پر ڈالنے کی بھرپور کوشش کرنا ہوگی کہ ''باادب بانصیب'' صرف ایک مقولہ نہ رہے، بلکہ ہمارے قول و فعل، مزاج اور رویے میں رچ بس جائے۔ ہر جماعت، پارٹی اور ادارے کے ذمے داروں کو اس پر باقاعدہ محنت کرنی چاہیے اور اپنے کارکنوں شاگردوں کو سکھانا چاہیے کہ سوشل میڈیا استعمال کرتے ہوئے کیا رویہ رکھا جائے، اختلافِ رائے کیسے کیا جاتا ہے، انھیں سمجھانا ہوگا کہ بحث واختلاف میں ہماری بات رائے کے اختلاف تک رہے۔ بات دلیل سے کریں اور انداز شائستہ وشستہ رہے۔ ہمارے کسی قول سے توہین اور تذلیل کا پہلو نہ نکلے۔

بیت السلام کی تعلیمی خدمات کا اعتراف

گزشتہ دنوں بیت السلام اولمپیاڈ کی اختتامی تقریب منعقد ہوئی، جس میں سال ہائے گزشتہ کی طرح شرعی عدالت کے جج جناب جسٹس محمد انور بھی تشریف لائے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں ایک بہت ہی اہم نکتہ بیان کیا: ''بیت السلام نے اس خیال کو غلط ثابت کردیا ہے کہ تعلیم خصوصاً اعلیٰ تعلیم پیسے کے بغیر ممکن نہیں، یہاں غریب سے غریب بھی انتہائی اعلیٰ تعلیم مفت حاصل کر رہا ہے۔'' کہنے کو یہ ایک جملہ ہے، لیکن اپنے اندر ایک جہاں دیدہ شخصیت کی زبان سے بیت السلام کی تعلیمی خدمات کی تعریف واعتراف ہے۔ بیت السلام کے سربراہ مولانا عبدالستار حفظہ اللہ کے گراں قدر وژن نے بیت السلام کی تعلیمی خدمات کو ایسا مفید اور مؤثر بنادیا ہے کہ عامۃ الناس کا بیت السلام کے تعلیمی اداروں کی طرف رجوع قابلِ رشک اور لائق تحسین بن گیا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اہلِ خیر کے لیے سعادت کا مقام وموقع بھی ہے کہ وہ بیت السلام کے شعبہ تعلیم کی مزید مضبوطی میں اپنا حصہ ڈالیں۔ مزید ادارے وجود میں آئیں اور ان اداروں کے لیے درکار وسائل دستیاب ہوں، تاکہ ہر شعبے میں ایسے رجالِ کار میسر آئیں جو ملک وملت کی ترقی کو اپنا مقصدِ زندگی اور مشن سمجھ کر خدمات انجام دیں۔

فہمِ قرآن

الانعام 107-110

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم

وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿110﴾

ترجمہ: جس طرح یہ لوگ پہلی بار (قرآن جیسے معجزے پر) ایمان نہیں لائے، ہم بھی (ان کی ضد کی پاداش میں) ان کے دلوں اور نگاہوں کا رُخ پھیر دیتے ہیں اور ان کو اس حالت میں چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں۔ ﴿110﴾

وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ ﴿111﴾

ترجمہ: اور اگر بالفرض ہم ان کے پاس فرشتے بھیج دیتے اور مردے ان سے باتیں کرنے لگتے اور (ان کی مانگی ہوئی) ہر چیز ہم کھلی آنکھوں ان کے سامنے لاکر رکھ دیتے، تب بھی یہ ایمان لانے والے نہیں تھے، اِلّا یہ کہ اللہ ہی چاہتا (کہ انھیں زبردستی ایمان پر مجبور کردے تو بات دوسری تھی، مگر ایسا ایمان نہ مطلوب ہے نہ معتبر) لیکن ان میں سے اکثر لوگ جہالت کی باتیں کرتے ہیں۔ ﴿111﴾

تشریح نمبر1: یہ وہ باتیں ہیں جن کی وہ فرمائش کیا کرتے تھے۔ سورۂ فرقان آیت: 21 میں ان کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ ہمارے اوپر فرشتے کیوں نازل نہیں کئے گئے؟ اور سورۂ دخان: 36 میں یہ مطالبہ کہ ہمارے باپ دادوں کو زندہ کرکے ہمارے سامنے لاؤ۔

تشریح نمبر2: یعنی حقیقت تو یہ ہے کہ تمام معجزات دیکھ کر بھی یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں، پھر بھی جو مطالبات کررہے ہیں، وہ محض جہالت پر مبنی ہیں۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُونَ ﴿112﴾

ترجمہ: اور (جس طرح یہ لوگ ہمارے نبی سے دشمنی کررہے ہیں) اسی طرح ہم نے ہر (پچھلے) نبی کے لیے کوئی نہ کوئی دشمن پیدا کیا تھا، یعنی انسانوں اور جنّات میں سے شیطان قسم کے لوگ، جو دھوکا دینے کی خاطر ایک دوسرے کو بڑی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے رہتے تھے اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرسکتے۔ لہٰذا ان کو اپنی افترا پردازیوں میں پڑا رہنے دو۔ ﴿112﴾

تشریح نمبر3: یہاں پھر وہی بات فرمائی جارہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو شیاطین کو یہ قدرت نہ دیتا اور لوگوں کو زبردستی ایمان پر مجبور کردیتا، لیکن چوں کہ مقصد امتحان ہے، اس لیے زبردستی کا ایمان معتبر نہیں۔

وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفْئِدَةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوا مَا هُمْ مُقْتَرِفُونَ ﴿113﴾

ترجمہ: اور (وہ انبیا کے دشمن چکنی چپڑی باتیں اس لیے بناتے تھے،) تاکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، اُن کے دل ان باتوں کی طرف خوب مائل ہوجائیں اور وہ ان میں مگن رہیں اور ساری وہ حرکتیں کریں جو وہ کرنے والے تھے۔ ﴿113﴾

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿114﴾

ترجمہ: (اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہو کہ) ”کیا میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو فیصل بناؤں، حالاں کہ اُسی نے تمہاری طرف یہ کتاب نازل کرکے بھیجی ہے، جس میں سارے (متنازعہ) معاملات کی تفصیل موجود ہے؟“ اور جن لوگوں کو ہم نے پہلے کتاب دی تھی، وہ یقین سے جانتے ہیں کہ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق لے کر نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا تم شک کرنے والوں میں ہرگز شامل نہ ہونا۔ ﴿114﴾

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿115﴾

ترجمہ: اور تمہارے رب کا کلام سچائی اور انصاف میں کامل ہے۔ اُس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ ہر بات سننے والا، ہر بات جاننے والا ہے۔ ﴿115﴾

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿116﴾

ترجمہ: اور اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کے پیچھے چلو گے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کرڈالیں گے۔ وہ تو وہم وگمان کے سوا کسی چیز کے پیچھے نہیں چلتے اور اُن کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ خیالی اندازے لگاتے رہیں۔ ﴿116﴾

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿117﴾

ترجمہ: یقین رکھو کہ تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اپنے راستے سے بھٹک رہا ہے اور وہی ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو صحیح راستے پر ہیں۔ ﴿117﴾

مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

فہم حدیث

نمازمیں قرأتِ قرآن

نمازِ عشاء میں رسول اللہ ﷺ کی قرأت

عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْعِشَاءِ وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ، وَمَاسَمِعْتُ أَحَدًا أَحْسَنَ صَوْتًا مِنْهُ (رواه البخاری و مسلم)

ترجمہ: حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو عشاء کی نماز میں سورہ والتین و الزیتون پڑھتے ہوئے سنا ہے اور میں نے آپ سے زیادہ اچھی آواز والا کسی کو نہیں سنا۔

مختلف اوقات کی نماز میں رسول اللہ ﷺ کی قرأت

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ مَا صَلَّيْتُ وَرَاءَ أَحَدٍ أَشْبَهَ صَلَوٰةً بِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ فُلَانٍ قَالَ سُلَيْمَانُ صَلَّيْتُ خَلْفَهُ فَكَانَ يُطِيلُ الرَّكْعَتَيْنِ الْأُوْلَيَيْنِ مِنَ الظُّهْرِ وَيُخَفِّفُ الْأُخْرَيَيْنِ وَيُخَفِّفُ الْعَصْرَ وَيَقْرَأُ فِي الْمَغْرِبِ بِقِصَارِ الْمُفَصَّلِ وَيَقْرَأُ فِي الْعِشَاءِ بِوَسْطِ الْمُفَصَّلِ وَيَقْرَأُ فِي الصُّبْحِ بِطِوَالِ الْمُفَصَّلِ (رواه النسائی)

ترجمہ: سلیمان بن یسار تابعی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے (اپنے زمانے کے ایک امام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا: ”میں نے کسی شخص کے پیچھے ایسی نماز نہیں پڑھی، جو رسول اللہ ﷺ کی نماز سے زیادہ مشابہ ہو فلاں امام کی بہ نسبت۔“ سلیمان بن یسار کہتے ہیں کہ ان صاحب کے پیچھے میں نے بھی نماز پڑھی ہے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ ظہر کی پہلی دونوں رکعتیں لمبی پڑھتے تھے اور دو پڑھتے تھے اور آخری دو رکعتیں ہلکی پڑھتے تھے اور عصر ہلکی ہی پڑھتے تھے اور مغرب میں قصارِ مفصل اور عشاء میں اوساطِ مفصل پڑھتے تھے اور فجر کی نماز میں طوال فصل پڑھا کرتے تھے۔

تشریح: ”مفصل“ قرآنِ مجید کی آخری منزل کی سورتوں کو کہا جاتا ہے، یعنی سورۂ حجرات سے آخر قرآن تک، پھر اس کے بھی تین حصے کیے گئے ہیں۔ حجرات سے لے کر سورۂ بروج تک کی سورتوں کو ”طوالِ مفصل“ کہا جاتا ہے اور بروج سے لے کر سورۂ لم یکن تک کی سورتوں کو ”اوساطِ مفصل“ اور لم یکن سے لے کر آخر تک کی سورتوں کو ”قصارِ مفصل“ کہا جاتا ہے۔

جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں رسول اللہ ﷺ کی قرأت

عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي رَافِعٍ قَالَ اِسْتَخْلَفَ مَرْوَانُ أَبَا هُرَيْرَةَ عَلَى الْمَدِينَةِ وَخَرَجَ إِلَى مَكَّةَ فَصَلَّى لَنَا أَبُو هُرَيْرَةَ الْجُمُعَةَ فَقَرَأَ سُوْرَةَ الْجُمُعَةِ فِي السَّجْدَةِ الْأُوْلَى وَفِي الْآخِرَةِ إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ بِهِمَا يَوْمَ الْجُمُعَةِ (رواه مسلم)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ کے مشہور غلام اور خادم ابو رافع رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبید اللہ بن ابی رافع (جو اکابر تابعین میں ہیں) بیان کرتے ہیں کہ مروان (جس زمانہ میں کہ امیر معاویہ کی طرف سے مدینہ کا حاکم تھا) حج وغیرہ کسی ضرورت سے مکہ معظمہ گیا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ان دنوں کے لیے) اپنا قائم مقام بنا گیا تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جمعہ کی نماز پڑھائی تو اس کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ اور دوسری میں سورۂ منافقون پڑھی اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو جمعہ کے دن یہ دونوں سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْعِيْدَيْنِ وَ فِي الْجُمُعَةِ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ، قَالَ وَإِذَا اجْتَمَعَ الْعِيدُ وَالْجُمُعَةُ فِي يَوْمٍ وَاحِدٍ قَرَأَ بِهِمَا فِي الصَّلوٰتَيْنِ (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عیدین اور جمعہ کی نماز میں بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى وَهَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ پڑھا کرتے تھے اور عید اور جمعہ دونوں ایک دن میں جمع ہو جاتے تو آپ دونوں نمازوں میں یہی دو سورتیں پڑھتے۔

عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ أَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ سَأَلَ أَبَا وَاقِدٍ اللَّيْثِيَّ: مَاكَانَ يَقْرَأُ بِهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي الْأَضْحٰى وَالْفِطْرِ؟ فَقَالَ: كَانَ يَقْرَأُ فِيهِمَا بِقٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ، وَاقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ: (حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھتیجے) عبید اللہ بن مسعود (تابعی) سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ”عید الاضحیٰ اور عید الفطر کی نماز میں رسول اللہ ﷺ کیا پڑھتے تھے؟“ انھوں نے فرمایا کہ ”آپ ﷺ ان دونوں میں ق والقرآن المجید اور اقتربت الساعۃ پڑھا کرتے تھے۔“ (صحیح مسلم)

تشریح: ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نماز جمعہ کی دونوں رکعتوں میں علی الترتیب اکثر و بیشتر سورۂ جمعہ اور سورۂ منافقون یا سورۂ اعلیٰ و سورۂ غاشیہ پڑھا کرتے تھے اور عیدین کی نماز میں بھی یا تو یہی دونوں آخری سورتیں سورۂ اعلیٰ و غاشیہ پڑھا کرتے تھے یا ق والقرآن المجید اور اقتربت الساعۃ

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ”حجۃ اللہ البالغۃ“ میں فرماتے ہیں: وَقَدِ اخْتَارَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بَعْضَ السُّوَرِ فِي بَعْضِ الصَّلَوٰاتِ لِفَوَائِدَ مِنْ غَيْرِ حَتْمٍ وَلَا طَلَبٍ مُؤَكَّدٍ فَمَنِ اتَّبَعَ فَقَدْ أَحْسَنَ وَمَنْ لَّا فَلَا حَرَجَ (حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَة)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے بعض نمازوں میں کچھ مصالح اور فوائد کے پیشِ نظر بعض خاص سورتیں پڑھنی پسند فرمائیں، لیکن قطعی طور پر نہ ان کی تعیین کی نہ دوسروں کو تاکید فرمائی کہ وہ ایسا ہی کریں۔ پس اس بارے میں اگر کوئی آپ کا اتباع کرے (اور ان نمازوں میں وہی سورتیں اکثر و بیشتر پڑھے) تو اچھا ہے اور جو ایسا نہ کرے تو اس کے لیے بھی کوئی مضائقہ اور حرج نہیں ہے۔

Shangrila
THE FOOD EXPERTS!
وقت کے ساتھ سب بدل جاتا ہے،
لیکن وہ گزرے دن اور خالص ذائقے، آج بھی یاد دلاتا ہے، شنگریلا اچار
گھر جیسا اچار چٹخارے دار...
Zip Lock
Shangrila
MANGO PICKLE IN OIL
آم کا اچار تیل میں
Shangrila
THE FOOD EXPERTS!
MIXED PICKLE IN OIL
مکس اچار تیل میں
www.shangrila.com.pk
ShangrilaPakistan
ShangrilaPakistan

حضرت مولانا عبدالستار حَفِظَہُ اللہ

دستورِ نجات صرف اسلام

زندگی کی معراج:

ہر شخص کام یاب ہونا چاہتا ہے۔ کام یابی اس کی زندگی کی معراج ہوتی ہے۔ میں ایک کام یاب انسان بنوں، میں کام یاب زندگی گزاروں، میرے بچے کام یاب ہو جائیں! یہ آرزو، یہ تمنّا اور یہ خواہش ہر زندہ انسان کے اندر ہوتی ہے۔ کفار کے ہاں، اہلِ دنیا کے ہاں، جن کی زندگی کا مقصد یہ دنیا ہے، ان کے ہاں! کام یابی کا نقطۂ نظر مادّیت کو اکٹھا کرنا ہے۔ ان کے خیال میں جس کے پاس دنیا کے مادّی اسباب زیادہ ہیں، وہی کام یاب ہے، جب مسلمان کفار سے کہنے لگے کہ کام یابی کی راہ یہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے دی ہے، یہ کام یابی کی راہ ہے تو وہ فوراً کہنے لگے: اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِیًّا انصاف سے کام لو اور دیکھو تو سہی! ہم دونوں میں بہتر حالت میں کون ہے؟ آرام میں ہم ہیں، محلّات ہمارے پاس ہیں، ساز و سامان ہمارے پاس ہے، عیش و عشرت کے اسباب ہمارے پاس ہیں اور تم دعوت دے رہے ہو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی زندگی ہی میں کام یابی ہے!

ایک وہم کا ازالہ:

آج چوں کہ مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت مادّی نظامِ تعلیم کے تحت ہوتی ہے تو انھیں بھی اسلام کے بارے میں شک ہونے لگتا ہے کہ یہ کیسے مسلمان ہیں، ہمیشہ پسماندہ دنیا میں رہیں گے اور ہمیشہ ترقی پذیر ملکوں میں رہیں گے، وہ دیکھو! ترقی یافتہ دنیا ہے، کام یاب تو وہ ہیں جو آج ترقی یافتہ دنیا میں رہ رہے ہیں، ان کے پاس زندگی کے بہت خوب صورت نقشے ہیں۔

یہ سوچ کر مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے والے بچے بسا اوقات ایمان، اسلام کے بارے میں بدگمان ہو جاتے ہیں کہ بھلا یہ راستہ کیسے کام یابی کا ہے کہ مسلمان ہمیشہ پسماندہ ہی رہیں، ترقی پذیر ہی رہیں، آزمائش اور تکلیفوں میں ہی رہیں۔ اگر کفر کا راستہ غلط ہے تو آج وہ ترقی یافتہ کیوں ہیں؟ اور ان کے پاس زندگی کے راحت و آرام کے ایسے شاندار نقشے کیوں ہیں؟ عام طور پر ذہن میں یہ خیال مسلمانوں کو آنے لگتا ہے تو قرآن نے ایک پیغام دیا ہے، اس پر غور کرنا چاہیے۔

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا جب مسلمانوں نے کفار کو کام یابی کی راہ کی دعوت دی تو کفار مسلمانوں سے کہنے لگے: اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِیًّا ذرا انصاف سے کام لو اور دیکھو کون اچھی حالت میں ہے۔ ہم یا تم! ہم زیادہ آرام میں ہیں یا تم! تم جھونپڑیوں میں رہ رہے ہو۔ تم اونٹ کا گوشت خشک کر کے مہینوں، مہینوں استعمال کرتے ہو۔ تمہارے پاس پہننے کا کپڑا بھی پورا نہیں ہے۔ ہم ترقی یافتہ ہیں اور تم پسماندہ! ہم خوشحال اور تم تنگدستی میں! ہم امن و امان میں ہیں اور تمہارے ہاں بدامنی اور انتشار! تم کیسے کہہ سکتے ہو حالات بدل جائیں گے؟ تم کام یاب ہو جاؤ گے اور ہم ناکام ہو جائیں گے۔ تم عزّت والے ہو جاؤ گے اور ہم رسوا ہو جائیں گے۔ تم آرام میں پہنچ جاؤ گے اور ہم پریشان ہو جائیں گے۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آج کی حالت تو دیکھو! تم کہاں کھڑے ہو اور ہم کہاں کھڑے ہیں۔ کام یابی کے بارے میں یہ نقطۂ نظر کفار کا ہے، جب کہ مسلمانوں کے ہاں کام یابی کیا ہے؟ یہ بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ قرآن نے کام یابی کے بارے میں کفار کا نقطۂ نظر بھی بتا دیا اور اہلِ اسلام کے ہاں کام یابی کیا ہے؟ یہ بھی بتا دیا کہ جو جہنم سے بچ گیا جنّت میں چلا گیا، وہ کامیاب ہو گیا۔ کفار کی عقل و دانش میں ظلمت ہے، وہ ساٹھ ستر سال کی زندگی کو ہی دیکھتے ہیں کہ کس کی آرام سے گزر رہی ہے اور کس کی مشکلات میں۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ آج کا مسلمان کام یابی کس کو سمجھتا ہے، دنیا کی مختصر سی زندگی کو یا آخرت کی زندگی کو جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گی، اس کا کبھی اختتام نہیں ہو گا۔ دیکھنا چاہیے کہ آج کا مسلمان کس کام یابی کو سامنے رکھ کر زندگی کے فیصلے کر رہا ہے، اپنے بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت میں کس کام یابی کو سامنے رکھ کر فیصلے کر رہا ہے۔

کامیابی صرف آخرت کی:

مسلمانوں کے ہاں تو کام یابی کا نقطۂ نظر ایمان ہوا کرتا تھا، روحانیت ہوا کرتی تھی، اُخروی لحاظ سے کام یابی ہوا کرتی تھی، ان کے سامنے اللہ ربُّ العزّت کا یہ ارشاد تھا کہ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا دنیا کی تاریخ تو دیکھو، جن کے پاس دنیا کی عیش و عشرت کے بڑے نقشے تھے، مضبوط سلطنتیں تھیں، غیر معمولی مادّی نقشے تھے۔ اللہ نے انھیں کیسے تباہ و برباد

کر دیا۔ کیسے رسوا و ناکام کر دیا۔ اگر کام یاب وہ ہوتے تو یہ بربادی تو ان پر نہ آتی۔ یہ ہلاکت تو ان کو نہ آتی۔ ایک بڑی غلط فہمی یا بہت کم فہمی، لاعلمی اور جہالت ہے کہ دنیا میں چوں کہ مغربی نظامِ تعلیم ہے جو مادّیت پر کھڑا ہے۔ اسی پر نئی نسل پروان چڑھ رہی ہے اور اس کا یہ ذہن بنادیا گیا ہے کہ تم نے منڈی اور مارکیٹ میں فروخت ہونا ہے۔ جتنی زیادہ تمہاری قیمت لگے، اتنی ہی تمہاری کام یابی ہے جو تمہیں زیادہ مہنگا خریدے گا، تم اسی کے ہاتھ فروخت ہو جانا، یہی تمہاری کام یابی ہے۔ بھلے تمہارا خریدار اسلام دشمن، دین دشمن اور ملک دشمن ہی کیوں نہ ہو، اگر تم منڈی میں مہنگے فروخت ہوئے تو یہ تمہاری کام یابی ہے۔ اِس ذہنیت کے ساتھ نئی نسل کی تربیت ہو رہی ہے، جب کہ اصل میں مسلمانوں کے ہاں کام یابی کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ساری دنیا بھی اگر خریدار بن جائے، دنیا کی ساری دولت بھی اکٹھی ہو جائے اور تمہاری قیمت لگنے لگ جائے، لیکن اگر وہاں تمہارا ایمان خطرے میں ہے تو تم صاف کہہ دینا کہ تمہارے پاس وہ دولت ہی نہیں ہے کہ مجھے خرید سکو! دنیا میں وہ سکہ ابھی رائج ہی نہیں ہوا جو مسلمان کی قیمت لگا سکے اور اہلِ ایمان اس سکے کے عوض فروخت ہو جائے۔ مسلمانوں کے ہاں ایمان ہی اصل قیمت رکھتا تھا، اس کی اتنی اور ایسی قدر و منزلت تھی حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ یعنی مسلمانوں کے لیے زندگی میں سب سے قیمتی اور سب سے محبوب ان کا ایمان ہے۔ ایمان سے بڑی کوئی دولت ہے ہی نہیں، جس صاحب کا ایمان بڑھیا ہے، جس کی ایمانی زندگی ہے، بس وہی کام یاب ہے۔

ذرا غور تو کرنا چاہیے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی صف میں حضرت بلال جو دنیاوی اور مادّی نقطۂ نظر سے ناکام تھے اور دشمنوں کی صف میں ولید بن مغیرہ جو مادّی نقطۂ نظر سے بڑا مال دار اور جاگیر دار اِس دور کا گیا گزرا اور انتہائی بدعمل مسلمان بھی کسے کام یاب سمجھتا ہے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو یا ولید بن مغیرہ کو؟ ایک طرف اللہ کے نبی ﷺ کے گھر میں فاقے اور دوسری طرف آپ ﷺ کا دشمن ابوجہل ہے، جو مکہ کا حکم ران ہے۔ گیا گزرا مسلمان بھی کس کو کام یاب سمجھے گا؟ یقیناً آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کو! ولید بن مغیرہ اور ابوجہل جیسے ہزاروں لاکھوں افراد بلال رضی اللہ عنہ کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں۔

آج کے مسلمان کی بدنصیبی:

یہ کتنی بدقسمتی اور بدنصیبی ہے کہ آج کے مسلمان جب اپنا موازنہ کفار سے کرتے ہیں تو انھیں کفار ہی کام یاب نظر آتے اور اپنے آپ کو ناکام سمجھتے ہیں۔ آج کے مسلمان اپنے بچوں کی کام یابی اسی میں سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس دنیاوی ساز و سامان ہو، اچھا گھر، بڑا بنگلا، بڑا عہدہ، مال و زر کی کثرت، نوکروں چاکروں کی بھیڑ۔۔۔ بھلا وہ خود ایمانی لحاظ سے کم زور ہو، نماز، روزہ اور تلاوتِ قرآن میں کیسا ہی کم زور ہو، اس طرف آج کے مسلمان کا ذہن جاتا ہی نہیں کہ کام یابی تو دین میں اور دین پر عمل کرنے میں ہے۔

تحیۃ الوضو کا انعام:

رسول اللہ ﷺ جب معراج سے واپس تشریف لائے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمانے لگے: ”بلال! ایسا کیا کام کرتے ہو، کون سی ایسی نیکی کرتے ہو کہ میں جب جنّت میں چل رہا تھا، تمہارے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی! اپنا عمل تو بتاؤ؟“ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ”یارسول اللہ ﷺ! اور تو کچھ نہیں کرتا، ہمیشہ باوضو رہتا ہوں اور جب بھی وضو کی ضرورت پڑتی ہے، وضو کرکے دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھ لیتا ہوں۔“ حضور ﷺ نے فرمایا: ”یہی تو وہ نیکی ہے، اللہ تعالیٰ نے جس کے بدلے یہ اونچا مقام عطا فرمایا۔“

مومن اور منافق کی پہچان:

آج مسلمانوں کو بہت غلط فہمی ہوتی ہے، جب کسی مخلص مسلمان اور ایمان والے کو کسی آزمائش میں دیکھتے ہیں، کسی تکلیف میں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اگر یہ سچے ہوتے تو آج یہ کام یاب ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اگر تمہارے پاس ایمان ہے تو غالب تم ہی رہو گے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ میاں! پھر یہ میدانوں میں مسلمان مارے کیوں جاتے ہیں؟ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ کو شہادت بھی ایسی ملی کہ جسم کے ٹکڑے ہوگئے، پہچان بھی مشکل ہوگئی، وہ تو ایمان کے اعلیٰ درجے پر تھے، پھر ایسا کیوں ہوا؟ فرمایا: اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ اگر تمہیں زخم لگے ہیں تو تمہارے دشمن کو بھی تو لگتے ہیں وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ یہ دن تو آتے رہتے ہیں۔ ظاہری طور پر کبھی ایک فریق آگے کبھی دوسرا، لیکن اللہ ربُّ العزّت یہ چاہتے ہیں وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس سے ایمان والوں کی پہچان ہوتی ہے کہ مومن کون ہے اور منافق کون ہے؟ مخلص کون ہے اور مفاد پرست کون ہے؟ اس جانچ پرکھ کے لیے مسلمانوں پر مشکل وقت آتا ہے۔ مسلمانوں کو قربانیاں دینا پڑتی ہیں وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ یہ مسلمان میدانوں میں اس لیے بھی دنیا سے جاتے ہیں، تاکہ اللہ انھیں شہادت کا بلند مرتبہ عطا فرمائے۔ شہادت کی تمنّا اللہ کے نبی ﷺ بھی فرمایا کرتے تھے، شہادت کی آرزو رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔ دنیا سے ایسا جانا کہ اللہ کے راستے میں میری جان چلی جائے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی آرزو رہی ہے، چاہت رہی ہے۔ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے: لَوَدِدْتُ أَنِّي أُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ ثُمَّ أُحْيَا ثُمَّ أُقْتَلُ اللہ تیرے راستے میں شہادت ملے پھر زندگی ملے، پھر شہادت ملے پھر زندگی ملے، پھر شہادت ملے۔۔۔!

حاصلِ سبق:

سبق یہی ملا کہ کام یاب وہی لوگ ہیں، جو ایمان کی حالت میں اللہ کے راستے میں قربان ہوتے ہیں۔ وہ کام یاب نہیں جو دنیاوی لحاظ سے اونچے عہدے پر ہو، جس کے پاس ساز و سامان زیادہ ہو، جس کا بنک بیلنس بہت زیادہ ہو۔ کام یابی کی اعلیٰ منازل پر وہ ہوتے ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ کے قرب کا اعلیٰ درجہ نصیب ہوتا ہے۔ اپنی سوچ کو درست رکھنا چاہیے۔ جب سوچ درست ہوگی تو عمل بھی درست ہوگا اور اگر سوچ ہی صحیح نہ ہوئی تو عمل کیا خاک ہوگا؟ کام یابی کا نقطۂ نظر ہمارے ذہنوں میں صحیح ہونا چاہیے۔ ہماری سوچ اور ہماری فکر درست ہونی چاہیے۔ اللہ ربُّ العزّت ہمیں ہر قسم کی برائیوں سے محفوظ رکھے۔ آمین!

علم کی عظمت

عذرا خالد

علم انسانی زندگی میں محض ایک ضرورت نہیں، بلکہ زندگی گزارنے کے لیے بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ وہ لازوال دولت ہے، جسے ایمان کی نعمت کے بعد انسان کا سب سے قیمتی اثاثہ قرار دیا گیا ہے۔ علم ہی وہ نور ہے جو جہالت کے اندھیروں کو مٹاتا ہے اور انسانی فہم و شعور کو نئی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ حقیقی معنوں میں، "علم" ہی "جاننا" ہے، اور اس علم کے بغیر فرد کے لیے دنیا میں بامعنی زندگی گزارنا ناممکن ہے۔ اسی لیے بقدرِ ضرورت علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرضِ عین ہے۔

قرآن کریم میں علم کی اہمیت:

نزولِ قرآن کریم کا سلسلہ جن آیات سے ہوا ان سے بھی قلم کی اہمیت اور علم کی عظمت ظاہر ہوتی ہے اور پہلا لفظ جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے قلب اطہر پہ نازل فرمایا وہ "اقراء" ہے، یعنی پڑھیے۔ علم کی فضیلت و عظمت، ترغیب و تاکید دین اسلام میں جس بلیغ و دل آویز انداز میں پائی جاتی ہے اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی، تعلیم و تربیت، درس و تدریس تو گویا اس دینِ حق کا لازمی جزو ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ حصولِ علم کی تلقین فرمائی، غزوہ بدر کے موقع پہ آپ ﷺ ہر قیدی کو جو مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتا تھا آزاد فرمادیتے تھے۔ اس عمل سے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی نظر میں تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

دین اسلام علم پر زور دیتا ہے اور کسی سطح پر بھی جہالت کو گوارا نہیں کرتا۔ قرآن مجید نے علم کو انسان کی امتیازی خصوصیت قرار دیا ہے۔ عالم اور جاہل کبھی برابر نہیں ہو سکتے کیونکہ علم روشنی اور جہالت تاریکی ہے۔ علم ہدایت ہے اور جہالت گمراہی ہے۔ علم انسان میں احساس بندگی کو اجاگر کرتا ہے اور اس کے اندر سے احساس برتری کو ختم، اور غور و فکر کو جنم دیتا ہے۔

"اللہ ان لوگوں کے درجے بلند کرے گا جو ایمان لائے، اور جنہوں نے علم حاصل کیا" (سورۃ المجادلہ)

ایک اور جگہ ارشاد ہوا کہ "اے نبی ﷺ! کہہ دیجیے کہ کیا علم رکھنے والے (عالم) اور علم نہ رکھنے والے (جاہل) برابر ہو سکتے ہیں، نصیحت تو وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں" (سورۃ الزمر)

سرورِ دو عالم ﷺ کی نظر میں علم کی فضیلت و اہمیت:

مسجد نبوی ﷺ کی پہلی درس گاہ اور اصحاب صفہ پر مشتمل طالب علموں کی پہلی جماعت کے عمل نے جلد ہی اتنی وسعت اختیار کر لی جس کی مثال دنیا میں آج تک کہیں نہیں ملتی۔ آپ ﷺ نے پہلے خود صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی تعلیم و تربیت کی پھر دوسروں کو تعلیم و تربیت دینے کے لیے کامل افراد کا انتخاب کیا، اس طرح تعلیم و تربیت کا یہ سلسلہ آپ ﷺ کی رحلت کے بعد بھی جاری و ساری رہا۔ آپ ﷺ کے منتخب کردہ، ان تربیت یافتہ معلّمین نے درس و تدریس میں جس مہارت کا ثبوت دیا وہ آپ ﷺ کی ہمہ گیر تربیت ہی کا نتیجہ ہے، جس کے اثرات تا قیامت جاری رہیں گے۔

سرورِ دو عالم حضرت محمد ﷺ نے علم کو محض ایک ذریعہ نہیں، بلکہ ایمان کا لازمی جزو اور جنت کا سیدھا راستہ قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جس نے علم کی طلب میں کوئی راستہ اپنایا، تو اللہ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔" (صحیح مسلم)

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

" جس نے ہدایت کی طرف بلایا اس کے لیے اتنا ہی اجر ہے جتنا اس پر چلنے والوں کے لیے ہے اور ان کے اجر میں کچھ کمی نہ کی جائے گی، جس نے گمراہی کی طرف بلایا اس کو اتنا ہی گناہ ملے گا جتنا کہ اس پر چلنے والوں کو ملے گا اور اس کے گناہ میں کچھ کمی نہ کی جائے گی" (مسلم 2674)

یہاں علم کی تلاش، جنت کی طرف براہِ راست رہنمائی کی ضمانت ہے۔

ایک اور جگہ، آپ ﷺ نے علم کو ایسا ثواب قرار دیا ہے جو انسان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اس کے نامہ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ کرتا رہتا ہے۔

آپ ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے: "جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے مگر تین چیزوں کا ثواب جاری رہتا ہے: صدقہ جاریہ، وہ علم جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔" (صحیح مسلم)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی ﷺ نے فرمایا: ”رشک صرف دو آدمیوں کی خصلتوں پہ کیا جائے، ایک وہ آدمی جسے اللہ نے دولت دی اور وہ اسے نیک کاموں میں خرچ کرتا ہو، دوسرے اس پر جس کو اللہ نے قرآن وحدیث کا علم دیا ہو اور وہ اس کے موافق فیصلے کرتا ہو اور لوگوں کو سکھاتا ہے“ (بخاری، مسلم)

علم کے حوالے سے حدیث مبارکہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے علم وہدایت کی جو باتیں مجھ کو دی ہیں ان کی مثال زوردار بارش کی طرح ہے، جو کسی زمین پر برسی، جو زمین عمدہ تھی اس نے پانی چوس لیا، اور اس نے گھاس اور سبزی خوب اگائی اور بعض زمین سخت تھی اس نے پانی تھام لیا، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس سے فائدہ پہنچایا، انہوں نے اسے پیا اور جانوروں کو بھی پلایا اور کھیتی باڑی کی۔ اسی زمین کے بعض ایسے حصے میں بارش ہوئی جو صاف چٹیل تھی اس نے نہ تو پانی روکا نہ گھاس اگائی (بلکہ پانی اس پر سے بہ کر نکل گیا) یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین میں سمجھ پیدا کی اور جو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو دے کر بھیجا اس سے اس کو فائدہ ہوا ،اس نے خود سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا۔ اور اس شخص کی مثال ہے جس نے اس پر سر ہی نہیں اٹھایا اور اللہ کی ہدایت جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں اسے نہ مانا“ (صحیح مسلم)

نبی مکرم ﷺ پوری دنیا کے لیے معلم بنا کر بھیجے گئے، آپ ﷺ کی وجہ سے دنیا میں علم کی روشنی پھیلی اور انسانیت کو روشن اور واضح راستہ ملا۔ اس کے باوجود ہر وقت اللہ کے حضور علم اور استقامت علم کے ساتھ ساتھ علم نافع کی دعا کرتے رہتے تھے۔

اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس علم سے جو نفع بخش نہ ہو اور اس دعا سے جو سنی نہ جائے اور اس دل سے جس میں خشوع نہ ہو اور اس نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو۔

علم نافع اور رزق وسیع کے لیے اللہ کے حضور یہ دعا بھی کرتے تھے: اے اللہ! میں تجھ سے علم نافع، عمل مقبول اور پاک رزق کی درخواست کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ اپنے پیارے حبیب ﷺ سے فرماتے ہیں: اے پیغمبر کہہ دیجیے: اے میرے رب! میرا علم زیادہ کر۔ (سورہ طٰہٰ)

اللہ نے انسان کو جو علم عطا کیا ہے، اسے ہی حرف آخر نہ سمجھا جائے، بلکہ مزید علم حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے اور اسے اپنی محنت اور جد وجہد کا نتیجہ نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ اسے اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت سمجھتے ہوئے اعتراف کرتے رہنا چاہیے اور شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔

جس کو علم وحکمت سے نواز دیا گیا، گویا اسے دین ودنیا کی دولت حاصل ہو گئی۔ ضروری ہے کہ جو علم عطا کیا گیا ہے اس کی قدر کی جائے اور اس کا صحیح استعمال کیا جائے۔ باری تعالیٰ نے اہل علم کی ستائش کرتے ہوئے فرمایا: اور جس کو حکمت مل گئی اس کو بڑی خوبی کی چیز مل گئی اور نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔ (البقرۃ)

اور آپ کو سکھائیں وہ باتیں جو آپ نہیں جانتے تھے اور یہ آپ کے رب کا فضل عظیم ہے۔ (النساء)

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: اللہ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے اور میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں اور دینے والا اللہ ہے۔

◆ علم کا حقیقی اظہار عملی زندگی میں مثبت تبدیلی لانے میں ہوتا ہے۔ یہ محض معلومات نہیں بلکہ وہ بصیرت ہے جو فرد کے کردار، اخلاق، اور فیصلوں کو جلا بخشتی ہیں۔

◆ دینی علم کی روشنی میں انسان اپنی ذمہ داریوں کو پہچانتا ہے اور یہ علم اسے تکبر سے دور رکھ کر عاجزی اور انکساری سکھاتا ہے۔

◆ سائنسی اور فنی علم جب عملی طور پر استعمال ہوتا ہے تو بیماریاں ٹھیک ہوتی ہیں، جدید سہولیات میسر آتی ہیں، اور قومیں معاشی طور پر مستحکم ہوتی ہیں۔

◆ علم سے انسان کو حکمت حاصل ہوتی ہے۔ جس کی بدولت وہ زندگی کے مشکل سے مشکل حالات میں جذبات کے بجائے دلائل اور حقائق کی بنیاد پر درست فیصلے کر کے ناپسندیدہ نتائج سے محفوظ رہتا ہے۔

علم کی اہمیت کے بارے میں بہت سے جلیل القدر مسلم دانشوروں، علما اور ائمہ کے اقوال موجود ہیں جو علم کو ایک لازمی فریضہ، روشنی اور نجات کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں: ”علم سے زیادہ مفید کوئی خزانہ نہیں ہے۔“

”علم مال سے بہتر ہے، کیونکہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تم مال کی حفاظت کرتے ہو۔“

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”عمل کے بغیر علم کچھ بھی نہیں، اور علم کے بغیر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔“

امام مالک رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: علم کی ضرورت جسمانی ضرورت سے زیادہ اہم ہے مزید فرماتے ہیں: ”لوگ کھانے اور پینے سے زیادہ علم کے محتاج ہیں۔“

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لوگوں کو کھانے پینے سے زیادہ علم کی ضرورت ہے، کیونکہ آدمی دن میں ایک یا دو بار کھانے پینے کا محتاج ہوتا ہے، جبکہ علم کی حاجت تو اتنی ہے جتنی [زندگی کے لیے] سانسوں کی ضرورت ہے۔“

امام شافعی رحمہ اللہ علیہ نے علم کے حصول کے لیے مشقت کی اہمیت اس طرح بیان کی ہے کہ ”پانچ چیزوں کے ساتھ علم حاصل نہیں کیا جا سکتا: تکبر، سستی، اکتاہٹ، غرور، اور بیزاری۔“

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے علم کو خوفِ خدا (خشیت) کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

”وہ علم جو (اللہ کا) خوف پیدا کرے، وہی نفع بخش علم ہے۔“ یہ اقوال اس بات پر متفق ہیں کہ علم صرف معلومات کا ذخیرہ نہیں بلکہ یہ انسان کے لیے روحانی روشنی، اخلاقی رہنمائی، اور دائمی کامیابی کا ذریعہ ہے۔

علم محض معلومات کا ذخیرہ نہیں، یہ انسانی زندگی کی بنیاد ہے۔ یہ ایسی بے پناہ طاقت ہے جو فرد کو دنیا میں کامیاب حکمت عملی اپنانے اور آخرت میں فوز وفلاح پانے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ اس لیے ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ علم کے حصول کو اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی کی سب سے پہلی اور سب سے اہم ترجیح بنائے۔ علم کی پیاس کو بجھانا ہی دراصل انسانیت کے جوہر کو پروان چڑھانا ہے!

زندگی کا سالنامہ

حفصہ سلطان

ایک سوال "وقت کی گرد کے نیچے چھپی وہ تحریر، جو خود ہم نے اپنے اعمال سے لکھی ہے۔"
ہر سال کے اختتام پر جب دسمبر کی ٹھنڈی ہوا کھڑکیوں سے آکر دل کے پردوں کو چھوتی ہے تو ایک خاموش سوال جنم لیتا ہے: "اس گزرے سال میں، میں نے کتنا جیا؟ اور کیسے جیا؟"
یہ سوال محض وقت کے گزرنے کا نہیں بلکہ زندگی کے مفہوم کا امتحان ہے۔ کیلنڈر کے صفحے پلٹ جاتے ہیں، دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدل جاتے ہیں، مگر اصل سوال یہ ہے کہ ان لمحوں میں ہم نے اپنی روح کو کتنا جگایا، اپنے رب کو کتنا یاد کیا اور اپنے ضمیر کو کتنا زندہ رکھا؟ وقت ایک ایسا گواہ ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ ہم دن کے شور میں بھول جاتے ہیں کہ ہر لمحہ ہماری زندگی کی کتاب میں درج ہو رہا ہے۔ ایک ایسی کتاب جس کے اوراق پر نہ گرد جمتی ہے، نہ سیاہی مٹتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ، وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا

ہر انسان کا عمل ہم نے اس کے گلے میں لٹکا دیا ہے، اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کھلی ہوئی کتاب نکالیں گے۔ (الاسراء: 13)

کیا ہم نے کبھی سوچا کہ وہ کتاب کیسی ہوگی، جس میں آج کی گفتگو، کل کا رویہ اور پرسوں کا گناہ یا نیکی سب محفوظ ہے؟
محاسبے کا عمل دسمبر صرف ایک مہینہ نہیں، بلکہ خود احتسابی کا موسم ہے۔ لوگ نئے سال کے استقبال کی تیاریاں کرتے ہیں، لیکن کوئی کم ہی ہوتا ہے جو گزرتے سال کے اعمال نامے کا مطالعہ کرے۔
ہم اپنے بینک اکاؤنٹ، تعلیمی کارکردگی یا ظاہری کامیابیوں کا حساب تو رکھتے ہیں، مگر اپنی روحانی کمائی کا کبھی جائزہ نہیں لیتے۔ اگر زندگی کو ایک دفتر سمجھا جائے تو ہر دن ایک صفحہ ہے، ہر لفظ ایک عمل اور ہر جذبہ ایک نیت۔ یہ دفتر ایک دن بند نہیں ہوگا، بلکہ اللہ کے سامنے کھولا جائے گا۔ تب فرشتے کہیں گے: "یہ ہماری کتاب تمہارے بارے میں سچ سچ بیان کردے گی، جو کچھ تم کیا کرتے تھے ہم لکھتے جاتے ہیں۔"
اعمال کی کتاب میں کیا لکھا ہے؟
کبھی ہم سوچتے ہیں کہ ہم نیک ہیں، کیوں کہ ہم نے کسی کو تکلیف نہیں دی۔ لیکن اس کتاب میں صرف برائیوں کی فہرست نہیں، بلکہ چھوٹی نیکیوں کی روشنی بھی محفوظ ہے۔ وہ لمحہ جب تم نے کسی غم زدہ کو مسکرا کر تسلی دی، وہ وقت جب تم نے اپنی ضرورت چھپا کر کسی اور کی مدد کی، وہ دعا جو تم نے کسی کے لیے خاموشی سے کی، یہ سب سنہری حروف میں درج ہیں۔ اسی طرح وہ غیبت جو ہم نے معمولی سمجھ کر کی، وہ نظر جو تکبر سے کسی کو حقیر جان کر ڈالی، وہ نماز جو دل کے بغیر پڑھی، یہ سب بھی اس دفتر میں نہایت باریکی سے لکھا جا چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہ تعصّب جانتی ہے، نہ سفارش! یہ صرف سچائی کی تحریر ہے جو خود ہم نے لکھی ہے، اپنے ہاتھوں سے، اپنی نیتوں سے، اپنے رویّوں سے۔
زندگی کے اس سالنامے میں کچھ صفحات خوشبو سے بھرے ہیں۔ وہ دن جب دل نے خلوص سے رب کو پکارا۔ اور کچھ صفحات دھندلے، اداس اور بوجھل ہیں، وہ دن جب ضمیر خاموش ہو گیا۔ لیکن اللہ کی رحمت یہ ہے کہ وہ کتاب صرف عدل سے نہیں بلکہ فضل سے پڑھی جائے گی۔ اگر کوئی انسان اپنے گناہوں پر سچے دل سے نادم ہو، اگر وہ توبہ کے آنسوؤں سے اپنے داغ دھو دے، تو وہ صفحے جو سیاہ تھے، اللہ کے حکم سے نور میں بدل جائیں گے۔
حدیث میں آتا ہے۔

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ

"توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں" (سننِ ابنِ ماجہ)

کیا ہی حسین انصاف ہے کہ ہمارا رب ہمارے اعمال کا حساب لیتا بھی ہے، مگر پہلے توبہ کا دروازہ کھول دیتا ہے۔
جب سردی کی راتیں لمبی ہو جاتی ہیں تو تہجد کا وقت بڑھ جاتا ہے۔ یہ وقت صرف عبادت نہیں، بلکہ اپنے اعمال نامے کی تصحیح کا وقت ہے، کیوں نہ اِس دسمبر کا ہم اپنے رب سے یہ کہہ کر آغاز کریں: "اے اللہ! جو کچھ لکھا گیا، اس میں سے وہ مٹا دے جو تجھے ناپسند ہے اور وہ باقی رکھ جو تیری رضا کا ذریعہ ہے۔"
نیا سال، نئی نیت زندگی کا سالنامہ ہر سال کے اختتام پر بند نہیں ہوتا، بلکہ اس میں نیا باب کھلتا ہے۔ یہ باب لکھا جائے گا احساس سے یا غفلت سے۔ ہم خود فیصلہ کرتے ہیں کہ ہمارا قلم کیسا چلے گا۔
آیئے! عہد کریں کہ آنے والے سال میں: کسی دل کو نہ توڑیں گے۔ کسی بھی نیکی کو چھوٹا اور معمولی نہیں سمجھیں گے۔ وقت کو اللہ کی نعمت مان کر ضائع نہیں کریں گے اور روز اپنے اعمال کی خود نگرانی کریں گے۔
یہی وہ طرزِ زندگی ہے جو روزِ حساب سے پہلے خود محاسبہ سکھاتی ہے۔ دسمبر کی شامیں ہمیں یہ یاد دلاتی ہیں کہ زندگی کا سورج ایک دن غروب ہو جائے گا، پھر نہ کوئی سالنامہ باقی رہے گا نہ نیا آغاز۔۔۔ بس! وہی کتاب ہوگی، جس کے صفحات پر ہم خود کہانی کے کردار بھی ہیں اور مصنّف بھی۔ ہر گزرتا دن ایک نیا صفحہ ہے اور ہر عمل ایک لفظ۔
سوال یہ ہے کہ ہم نے اپنی کہانی کیسی لکھی ہے؟
تو کیوں نہ آج سے ہم اپنی کہانی کو خوب صورت بنالیں؟
کیوں نہ قلمِ نیت سے نیکی کے حروف لکھیں اور توبہ کی سیاہی سے گناہوں کو مٹادیں؟ کیوں کہ آخر میں سوال یہ نہیں ہوگا کہ کتنے سال جیے؟ بلکہ یہ کہ ان سالوں میں کیا لکھا؟
وقت کی ڈائری بند ہونے کو ہے اور قلم اب بھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ بس دیکھنا یہ ہے کہ آخری سطر میں کیا لکھا جائے گا۔ وقت کا دریا اپنی روانی میں سب کچھ بہا لے جاتا ہے، مگر جو باقی رہ جاتا ہے وہ انسان کے اعمال کی خوش بو یا اس کی غفلت کا بوجھ ہے۔ زندگی کی یہ کتاب اب بھی کھلی ہے، قلم ہمارے ہاتھ میں ہے اور سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی۔
چاہیں تو اپنی غلط سطور مٹالیں، چاہیں تو انھیں توبہ کے آنسوؤں سے دھوڈالیں۔
کیوں کہ ایک دن جب یہ کتاب ربِّ کائنات کے سامنے کھولی جائے گی تو فیصلہ ہمارے لکھے پر ہوگا اور اُس دن کامیاب وہی ہوگا، جس کے صفحات میں نیت کی روشنی، اخلاص کی مہک اور استغفار کی نمی باقی ہوگی۔

صفحاتِ عمر پلٹ کر دیکھو ذرا اے دل! کیا کچھ لکھا ہے، ہم نے اور کیا لکھنا باقی ہے

NEW Zaiby Jewellers CLIFTON
A TRUSTED NAME IN JEWELLERY SINCE 1974
BETWEEN ART & GEOMETRY,
IMAGINATION & REALITY
03085888455 021 35835455, 35835488
S-11, Yousuf Grand Square, Block 8, Clifton

بلالِ الحبشی رضی اللہ عنہ

دانیال حسن چغتائی

عرب کا صحرا تھا۔ گرمیوں کا موسم اور دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی اس قدر شدید کہ خدا کی پناہ! زمین بھٹی کی طرح تپ رہی تھی۔ ریت کے ذرّوں پر چنگاریوں کا گمان ہوتا تھا۔ لو کے جھونکے آگ کے لپکتے ہوئے شعلے نظر آتے تھے۔ انسان تو انسان پرندے اور چوپائے بھی باہر نکلنے سے گھبراتے تھے۔ اس عالم میں شہر سے باہر ایک نوجوان تنومند غلام زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اسے جلتی ہوئی ریت پر چت لٹایا گیا تھا۔ اس کے سینے پر دو بھاری پتھر رکھے ہوئے تھے۔ اس کا ظالم آقا کوڑا لیے اس کے سر پر کھڑا تھا۔ اس مجبور و بے کس غلام کی تکلیف کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ جسم پتھروں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ بدن کی کھال ریت کی گرمی سے جل رہی تھی۔ زنجیروں کی وجہ سے حرکت تک کرنا ممکن نہیں تھا۔

اس پر مزید یہ کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد جسم پر کوڑے بھی برسائے جاتے تھے، لیکن آفرین ہے اس کے صبر واستقلال پر! وہ نہ آہ وبکا کر رہا تھا نہ گلہ وفریاد۔ اس کی زبان پر ایک ہی کلمہ مسلسل جاری تھا: أحد أحد یعنی خدا ایک ہے، خدا ایک ہے۔

اس کے ظالم اور سنگ دل آقا کو اسی کلمے سے چڑ تھی۔ وہ بتوں کا پجاری تھا اور کئی خداؤں کو ماننے والا تھا۔ وہ کیوں کر برداشت کر سکتا تھا کہ اس کا غلام سارے بتوں کو چھوڑ کر صرف ایک خدا پر ایمان لے آئے، لیکن یہ باہمت غلام کفر وشرک سے بیزار ہو چکا تھا۔ اس نے جب سے حضرت محمد ﷺ کا پیغام سنا تو ان کی رسالت پر ایمان لے آیا۔ وہ سچے دل سے خدائے واحد کی عبادت کرتا تھا اور حضرت محمد ﷺ کا پیروکار بن گیا تھا۔ اس دل اور نوجوان نے اپنا عقیدہ چھپا کر نہیں رکھا تھا، چناں چہ اس کا مالک جو مشرک تھا، اس کی جان کا دشمن ہو گیا تھا۔ وہ اس پر ظلم وستم ڈھاتا تھا، تا کہ تنگ آ کر وہ غلام دینِ حق سے منہ موڑ لے اور حضرت محمد ﷺ سے اپنا تعلق توڑ لے، لیکن یہ بات اس غلام کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی۔ اس کا ایمان تھا کہ دنیا کی چند روزہ تکلیفیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

مؤمن غلام کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک کوئی ایک دو دن کی بات نہیں تھی۔ اس نے جب سے اسلام قبول کیا تھا اس کے ساتھ یہی برتاؤ کیا جا رہا تھا۔ کبھی اسے گلیوں میں گھسیٹا جاتا تھا اور کبھی بُری طرح مارا پیٹا جاتا تھا۔ کبھی تپتی ریت پر تپایا جاتا تھا اور کبھی گرم کوئلوں پر لٹایا جاتا تھا، لیکن ان سارے مظالم کے مقابلے میں اس کا ایک ہی جواب تھا: أحد أحد

یہ مشقِ ستم جاری تھی کہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ادھر سے گزرے۔ انھوں نے اس ستم رسیدہ غلام کی یہ حالت دیکھی تو ان کا دل بھر آیا۔ انھوں نے اس کافر مالک کو منہ مانگی رقم دے کر اس غلام کو خرید لیا اور اسے آزاد کر دیا۔

پہاڑ جیسا حوصلہ رکھنے والے یہ غلام کون تھے؟ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ! آپ غلامی سے نجات پاتے ہی حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور اپنی باقی زندگی اسلام کے لیے وقف کر دی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ پیدائشی غلام تھے۔ آپ کے آقا کا نام امیہ بن خلف تھا جو حضرت محمد ﷺ اور اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں، جنھوں نے اسلام کی دعوت قبول کرنے میں سبقت کی۔ بالغ مردوں میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد آپ ہی ایمان لائے۔

یہ اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ مکے میں مسلمانوں کی حالت بڑی کم زور تھی۔ کفارِ مکہ اسلام لانے والوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بناتے تھے۔ خود نبیٔ اکرم ﷺ کو جسمانی اذیتیں پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس دور میں اسلام قبول کرنا مصائب کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ خاص طور پر کسی ایسے غلام کے لیے قبولِ اسلام کا اعلان بڑے دل گردے کا کام تھا، جس کا آقا متعصّب، مشرک اور مسلمانوں کا دشمن ہو۔ اس زمانے میں مالک کو غلام پر پورا اختیار حاصل ہوتا تھا، وہ جیسا چاہتا تھا ویسا سلوک غلام کے ساتھ کر سکتا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس انجام سے ناواقف نہ تھے، لیکن ان کے دل میں نبیٔ کریم ﷺ کی محبت اور اسلام کی عظمت کا ایسا نقش بیٹھ چکا تھا کہ انھوں نے اس آزمائش کی ذرّہ برابر پروا نہ کی۔ انھوں نے اپنے عقیدے پر قائم رہ کر استقامت اور پامردی کی بے نظیر مثال قائم کر دی۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ اسلام کے دائرے میں آئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے انھیں یہ عزّت بخشی کہ انھیں ذاتی خادم اور معاون مقرر فرمایا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت اور گھریلو کام کاج کے پورا کرنے کو عبادت وسعادت سمجھتے تھے۔ اعتماد کا یہ عالم تھا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نبیٔ اکرم ﷺ کے خازن تھے۔ جب تک نبیٔ اکرم ﷺ اس دنیا میں موجود رہے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں رہے۔ یہ عظیم سعادت ہے جو قدرت نے حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کے لیے وقف کر رکھی تھی۔

ہجرت کے پہلے سال نبی کریم ﷺ نے نمازیوں کو جمع کرنے کے لیے اذان کا طریقہ مقرر فرمایا تو اذان دینے کی خدمت حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہی کے سپرد فرمائی۔ اسی لیے آپ کو مؤذّنِ رسول کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔ آپ کسی وجہ سے ”ش“ کی آواز ادا نہ کر سکتے تھے اور اشہد کو اسہد کہتے تھے، لیکن ان کے اخلاص ومحبت اور دینی فداکاری کا جذبہ خدا کے رسول ﷺ کو اس قدر پسند تھا کہ ان کا یہ انداز بھی سب کے لیے قابلِ قبول تھا۔

جب تک نبی کریم ﷺ دنیا میں زندہ رہے، مدینہ اور گردونواح کی فضاؤں میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذانیں گونجتی رہیں۔ صرف یہی نہیں، جب مکہ فتح ہوا تو حضور ﷺ کے حکم سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے خانۂ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر پہلی اذان دی۔ یہ اذان اس امر کا اعلان تھا کہ آج سے اللہ کا یہ گھر صرف خدائے واحد کی عبادت کے لیے مخصوص ہو چکا ہے اور صرف مکہ ہی نہیں، بلکہ پورے جزیرۂ عرب پر اسلام کا غلبہ ہو چکا ہے۔ اس عظیم اعلان کا یہ فخر وشرف بلال رضی اللہ عنہ کے سوا کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔

اسلام نے انسانی مساوات کا جو تصور دیا ہے، اس کا ایک مظہر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی ذات بھی ہے۔ آپ حبشی نسل کے تھے اور پیدائشی غلام! اس دور میں عرب کے بھی قبائل

وہی صبح وہی شام

سیدہ ناجیہ شعیب احمد

"صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے زندگی یوں ہی تمام ہوتی ہے۔ عجیب اُکتایا ہوا معمولِ زندگی ہے۔ تنگ آ گئی ہوں میں اس بورنگ، رف اینڈ ٹف یعنی سخت اور بے لطف زندگی سے۔ بھلا یہ جینا بھی کوئی جینا ہے؟"

آپ نے اکثر اس طرح کے مایوس کن الفاظ پر مشتمل جملے سنے ہی ہوں گے۔ لگتا ہے کہ ایسا کہنے والے اپنے معمولاتِ زندگی سے تنگ آ گئے ہیں یا اُکتا گئے ہیں۔ انھیں اپنی یکسانیت اور لگی بندھی روبوٹ نما زندگی گزارنا کسی طور گوارا نہیں، مگر خون کے یہ گھونٹ پینے پر مجبور ہیں۔ کوئی زندگی کی بے رونقی سے گھبرا کر اس حد تک مایوس ہو جاتا ہے کہ اپنی جان تک لے لیتا ہے۔

اکثر لوگوں کو یہ بھی کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ میری روٹین لائف (یعنی روزمرّہ کی زندگی) بہت سخت ہے۔ سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اس روٹین لائف کے ماروں کا الگ ہی رونا ہے۔ دفتری اوقات میں روزمرّہ معمولات میں مصروف رہنے والے شوہر کے پاس بیوی کا فون اٹھانے کی فرصت نہیں۔ اُدھر گھریلو کاموں میں اُلجھی ہوئی خاتونِ خانہ کے پاس اپنی ذات کے لیے ایک لمحہ بھی میسر نہیں۔ ایک پاؤں باورچی خانے میں، دوسرا غسل خانے میں۔ ادھر نہاتے ہوئے میاں کو تولیہ پکڑانے کے لیے بھاگی، اُدھر چولہے پر چڑھا دودھ ابل پڑا۔ بچوں کی چیخ وپکار، امی میرے موزے! "اماں میرا بستہ!" ساس کو وقت پر دوا دینے میں تاخیر نہ ہو جائے، اگر بلا اطلاع آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارت میں ذرا سی کمی رہ جائے تو گھر، میدانِ جنگ کا سماں پیش کرنے لگتا ہے۔ ویک اینڈ یعنی ہر ہفتے کے اختتام پر ڈھیروں پروگرام بنائے جاتے ہیں جو اکثر پورے نہیں ہو پاتے۔ ارمانوں پہ اوس پڑتی رہتی ہے۔ گھن چکر بنی خاتونِ خانہ اس روٹین لائف سے اس قدر اُکتا جاتی ہے کہ بات بات پہ کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔

◆◆◆

یعنی لگی بندھی روبوٹ نما زندگی میں کچھ تو تبدیلی ہو۔ وہی صبح، وہی شام، کام کام اور بس کام۔ دن کے چوبیس گھنٹوں اور ہفتے کے سات دنوں میں طبیعت ایک سی نہیں رہتی۔ دل ایک ہی طرح کے معمول سے اوب کر شدّت سے تبدیلی چاہتا ہے۔ گھریلو بکھیڑوں میں الجھی خاتونِ خانہ کا دل کچھ نیا چاہتا ہے۔ دلی خواہش لبوں پر مچلتی رہتی ہے کہ کام پر سے تھکے ماندے شوہر صاحب گھر آئیں تو انھیں ساحلِ سمندر لے چلیں۔ وہاں ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ننگے پیر ساحلِ سمندر پر گھنٹوں ٹہلیں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

دفتری اوقات میں دماغ کھپاتے، دن بھر محنت مزدوری کرنے والے مرد کو تو "نندیا پری (نیند)" سے بڑھ کر کوئی شے عزیز نہیں۔ انھیں اپنی ٹف دفتری روٹین لائف (یعنی سخت دفتری معمولات) میں سے چند گھنٹے لمبی تان کر سونے کی تمنا ہے، یا دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کی خواہش۔۔۔ یعنی ہر کوئی چاہتا ہے "ایک مُٹھی آسمان۔"

◆◆◆

بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ! کے مصداق آج کے بچے بھی صبح سویرے اسکول، دوپہر کو قاری صاحب، شام کو ٹیوشن اور رات کو وقت پر سونا، تاکہ صبح جلدی اٹھیں۔۔۔ اس لگی بندھی زندگی سے نجات حاصل کرنے کے لیے نِت نئے بہانے تراشے جاتے ہیں اور تو اور۔۔۔ سنا ہے کچھ لوگ روزانہ ایک ہی چہرہ آئینے میں دیکھ دیکھ کر اس قدر بے زار ہو گئے ہیں کہ

جب چاہیں ایک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پہ کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

رات بھر چارپائی پر کھانستے بوڑھے باپ کو تبدیلیِ ہوا کی ضرورت ہے۔ صبح، شام جائے نماز پر عبادت میں مشغول بوڑھی ماں شدّت سے تبدیلی کی خواہاں ہے۔

دس سال سے بسترِ مرگ پر پڑا لاغر وجود، جو کروٹ لینے سے بھی معذور ہے، ٹکٹکی باندھے چھت پر لگے پنکھے کو تکتے تکتے اپنی موت کا انتظار کرتے تھک گیا ہے۔ اسے بھی اس معمول کی محتاج واپاہج زندگی سے نجات چاہیے۔

بقول شاعر:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

انسان کی جبلّت و فطرت میں ہے کہ وہ بہت جلد یکسانیت سے اُکتا جاتا ہے۔ عُجلت پسند ہے۔ کھوجنا، کریدنا، کچھ نیا چاہنا۔۔۔ اس کی سرشت میں ہے، جسے جستجو نہیں، جو اپنے معمول سے اکتاتا نہیں، اسے لوگ بورنگ پرسن (یعنی پھیکا اور بے لطف شخص) یا روبوٹ کہتے ہیں۔

صاحب! زندگی، زندہ دلی کا نام ہے — مردہ دل بھلا خاک جیا کرتے ہیں؟

عبیرہ ایک خاتونِ خانہ ہے جو تندہی کے ساتھ روزانہ گھر کے تمام کام بخوبی سرانجام دیتی ہے۔ بیرونِ ملک رہنے والی اس کی پکی سہیلی فروا نے اسے "کولہو کا بیل" کا خطاب دے رکھا ہے۔ موصوفہ نے اس سیدھی سادی اللہ میاں کی گائے، خاتون کو وہ وہ پٹیاں پڑھائیں کہ الامان الحفیظ! اب عبیرہ خاتون کو گھریلو ذمے داریاں بوجھ لگتی ہیں۔ منہ بسور کر کہتی ہیں: "تنگ آ گئی ہوں اس روبوٹ نما بدمزہ زندگی سے۔ نہ کوئی تفریح نہ دل پشوری کا انتظام، بس صبح شام کولہو کے بیل کی طرح کاموں میں جُتے رہو۔"

مانا کہ شکوہ بجا ہے پر کیا کریں؟ جسے دیکھیں وہ کاروبارِ زندگی میں اُلجھا ہوا ہے۔ کیسی تفریح؟ یہاں کھانے کمانے کے لالے پڑے ہیں اور بی بی کو "ہری ہری سوجھ رہی ہے!"

کچھ معمولاتِ زندگی۔۔۔ نماز و عبادات۔۔۔ مصلحتاً و حکمتاً اولادِ آدم کے لیے اشد ضروری ہیں۔ اگر یہ معمول نہ ہو تو بندے راہِ حق سے بھٹک جائیں، تباہ و برباد ہو جائیں۔

یہ روٹین نما پنج وقتہ نمازیں انسان کو اس کی اوقات میں رکھتی ہیں۔ اسے بتاتی ہیں کہ "زندگی جیسے چاہو جیو" کا نعرہ مستانہ نہیں بلکہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی بندگی کا تقاضا ہے کہ اس ذاتِ پاک کو معمول کے مطابق سجدہ کیا جائے، بنا کسی اکتاہٹ اور بے زاری کے۔۔۔ جیسے اے بندے! تو معمول کے مطابق کھانا پینا، کھانے سے نہیں اکتاتا تو تجھے اپنے مالک و رازق کے آگے پانچ وقت کی عبادت کرتے ہوئے بھی خشوع و خضوع اختیار کرنا چاہیے۔ عبادات میں مشغول رہنے والی یہ روٹین تمام معمولاتِ زندگی پر بھاری ہے۔۔۔ یہ تو بڑی ہی پیاری روٹین ہے۔

تمام بحث سے قطع نظر! سچ پوچھیں تو لگی بندھی زندگی سے ہم بھی خار کھائے بیٹھے ہیں۔ سوچتے ہیں کچھ تو نیا، منفرد اور اچھوتا ہو۔۔۔ پر جو بھی ہو، خیر و عافیت اور سلامتی کے ساتھ ہو۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہمیں ناگہانی اور اچانک ملنے والی تکلیف دہ تبدیلی میں مبتلا ہونے سے بال بال محفوظ رکھے اور جو معمول ہے اسی پر قناعت کر کے صبر اور شکر بجالانے کی حتیٰ الامکان سعی کیجیے۔ پھر بھی، سو جتن کرنے کے باوجود جو کبھی طبیعت میں معمول سے ہٹ کر تبدیلی چاہنے کا اُبال اٹھے اور جیب اجازت دے تو ہوا خوری کے لیے کسی پُر فضا مقام پر ہو آیئے۔ نہیں تو جایئے اپنی حسرتوں پر چار آنسو بہا کر سو جایئے۔۔۔!

یہ دنیا کا دستور ہے۔ یہاں کبھی نہ کبھی، کچھ نہ کچھ معمول سے ہٹ کر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔

بس ہمت نہیں ہارنی۔ مایوسی سے احتراز برتیں۔ جسمانی غذاؤں اور دواؤں کے ساتھ روحانی غذا و دوا وانماز، تلاوت و درود شریف، اذکارِ الٰہی کی پابندی کریں۔ طبیعت زیادہ خراب ہو تو سب سے بڑے اور اصلی معالج یعنی اللہ میاں سے رجوع کریں۔

بلاشبہ زندگی کی یکسانیت سے گھبرا جانا فطری اور طبعی ہے، مگر اصل کامیابی اسی میں ہے کہ انسان اپنے معمولات میں شکر، صبر اور قناعت کے رنگ بھر دے۔ اگر دل تبدیلی چاہے تو شکوہ نہ کرے بلکہ اپنی توانائی کو عبادت، خدمت یا تخلیق میں لگا دے۔ یہی زندہ دلی ہے، یہی خوش بختی ہے اور یہی نجات کا راستہ ہے۔

بقیہ

بلال الحبشی رضی اللہ عنہ

بالخصوص قریشِ مکہ میں خاندانی عصبیت اور نسبی تفاخر کا جذبہ حد درجہ موجود تھا۔ غیر عرب قوموں اور غلاموں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، لیکن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اسلامی برادری میں وہ بلند مقام ملا، جس پر اونچے خاندانوں کے بڑے بڑے سرداروں کو بھی رشک آتا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو غلام نہیں، بلکہ سیّدنا بلال کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس لیے کہ اسلام میں عزّت اور بزرگی کا معیار، رنگ و نسب یا ملک و وطن نہیں بلکہ تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ سفر و حضر میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ رہے۔ تمام غزوات میں بھی حضور کی معیت کا شرف حاصل کیا۔ جب حضور دنیا سے رحلت فرما گئے تو آپ پر غم و اندوہ کی شدید کیفیت طاری ہو گئی۔ آپ نے اذان دینی بھی ترک کر دی، کیوں کہ حضور کی جدائی کے احساس سے آپ کے قلب پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ کچھ مدّت اسی درد و غم کی حالت میں گزارنے کے بعد آپ اسلامی فوجوں کے ساتھ ملکِ شام کی طرف چلے گئے اور جہاد میں حصہ لینے لگے۔

حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے صرف دو بار اذان دی۔ ایک موقع وہ تھا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں بیت المقدس کے سفر پر تشریف لے گئے۔ آپ نے حضرت بلال سے اذان دینے کی فرمائش کی۔ پہلے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عذر خواہی کی، لیکن جب اصرار حد سے بڑھ گیا تو اذان کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

بلال کی صدائے اذان سے فضا گونجنے لگی۔ دل کے جذبات نے اس آواز میں جادو بھر دیا تھا۔ آپ کے منہ سے اذان کے کلمات ادا ہوتے جا رہے تھے اور سننے والوں کے دل موم کی طرح گھلتے جا رہے تھے۔ سارے لشکر پر رقت کا عالم طاری تھا، جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم ﷺ کی مجلسوں کا نقشہ دیکھ رکھا تھا، ان کے دلوں میں وہ خوشگوار یادیں تازہ ہو گئیں۔ نبی اکرم ﷺ کی جدائی کا احساس دوبارہ زندہ ہو گیا اور سب کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو بڑے حوصلے اور پکے دل والے آدمی تھے، وہ بھی غم کی تاب نہ لا سکے اور بے اختیار اشک بار ہو گئے۔

اسی طرح ایک بار حضرت بلال روضۂ رسول کی زیارت کے لیے شام سے مدینہ آئے۔ لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ مسجدِ نبوی میں اذان دیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے پہلو تہی کی کیوں کہ انھیں جب بھی نبی اکرم ﷺ کا زمانۂ حیات یاد آتا تو ان کا دل غم سے بھر جاتا تھا، لیکن جب حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما نے فرمائش کی تو نبی کے پیارے نواسوں کی بات ٹال نہ سکے اور اذان کے لیے کھڑے ہو گئے۔

مسجدِ نبوی سے بلال کی صدائے تکبیر بلند ہوئی تو مدینے کی فضاؤں میں درد و الم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس آواز میں ایسی کشش تھی کہ جس نے سنا بے اختیار مسجد کی طرف کھنچا چلا آیا اور مدینے میں ایک بار پھر زمانۂ نبوت کا سماں پیدا ہو گیا۔

آپ رضی اللہ عنہ کی زندگی وہ مبارک زندگی ہے، جس کا ایک ایک لمحہ خدا اور رسول کی محبت و اطاعت اور دینِ اسلام کی خدمت میں صرف ہوا۔ اسی اخلاص اور فداکاری نے انھیں وہ بلند مقام عطا کیا جو دنیا کے کسی شہنشاہ کو بھی نصیب نہیں ہوا۔

حبيبي
HABEEBI
Divine Cherry
Pour Femme
HABEEBI
e100ml 3.4FL.OZ
The World of Fragrance
REIMAGINED!
www.habeebi.store

عمرانہ نعمت اللہ

قرآن سے محبت کی عجیب داستان

مدینہ طیبہ کے ایک شیخ اور امامِ مسجد الشیخ علی العامری کے قلم سے قرآن سے محبت، تعلق وار فتگی اور شوق کی ایک مثالی کہانی، جسے قارئینِ فہم دین کے لیے عمرانہ نعمت اللہ نے اردو قالب میں ڈھالا ہے۔

یہ کہانی کافی عرصے سے میرے دل میں گردش کر رہی اور تحریری شکل میں ڈھالنے کے لیے مجھ سے فرمائش کرتی رہی ہے۔ پہلے پہل یہ خیال بھی ستاتا رہا کہ یہ لکھنا کہیں خود پسندی، عُجب اور تکبر نہ بن جائے، لیکن پھر یہ سوچ کر لکھنے کا فیصلہ کر ہی لیا کہ اپنی مدح اور تعریف مقصد ہے نہ ہی اس کے ذریعے شہرت حاصل کرنے کی آرزو ہے، بلکہ یہ کہانی لکھنے کا مقصد حفظ، قرآن کا شوق و رغبت دلانا ہے اور یادِ الٰہی، کلام الٰہی سے محبت اور عقیدت کا وہ پہلو قارئین کو پیش کرنا ہے جو اس کا مرکزی خیال ہے۔ کیا خیال ہے، اصل کہانی شروع کی جائے۔ یہ ذکر بے جا نہیں ہو گا کہ یہ کہانی رمضان 1439ھ کی 29ویں شب جب تکمیلِ قرآن ہوتی ہے، مسجدِ نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم میں لکھی۔

◆◆◆

قرآنِ کریم حفظ کرنے کا جذبہ کافی وقت سے میرے دل و دماغ میں موجزن تھا، بس آغاز کی نوبت نہیں آ پا رہی تھی، پھر ایک دن بسم اللہ کر کے شروع کر دیا۔ اُس وقت میری عمر لگ بھگ پندرہ سال تھی۔ گھر کے ایک کمرے میں نمازِ عصر کے بعد قبلہ رو بیٹھ جاتا، دروازہ بند کر دیتا، تاکہ کوئی مخل نہ ہو۔ پہلے نئے دو صفحے یاد کرتا اور پھر پچھلا یاد کیا ہوا دہراتا، عصر اور مغرب کے درمیان کا یہ ایک گھنٹہ میرے لیے برکت والا ہوتا گیا۔ مغرب کے بعد حرم میں جا کر اپنے شیخ کو پہلے حفظ کیا ہوا سبق سناتا اور پھر اگلے دن کا سبق ناظرہ پڑھ کے سناتا، پھر کسی طالبِ علم کے ساتھ عشاء تک دہرائی کرتا۔۔۔ میں انھیں منزل سناتا اور وہ مجھے سناتے اور عشاء پڑھ کر گھر واپس آ جاتا۔

◆◆◆

آہستہ آہستہ قرآن سے میرا شغف بڑھتا چلا گیا۔ میری کیفیت بہت عجیب ہوتی چلی گئی۔ نیا سبق یاد کرتے ہوئے تصور ہی تصور میں وہ مناظر دیکھتا کہ حضرت جبرئیل علیہ السّلام کیسے تشریف لاتے ہوں گے اور ہمارے آقا ﷺ کے لیے یہ آیات لے کر آئے ہوں گے۔ اگر کسی دن سبق یاد نہ کر پاتا تو ایسا بوجھ ہوتا اور آقا ﷺ کی اس کیفیت کا استحضار کرتا جو فطرتِ وحی کے زمانے میں آپ ﷺ کی تھی۔

مجھے قرآن پڑھنے خصوصًا نیا سبق یاد کرنے میں ایسی لذّت ملنے لگی، جس کے مقابلے میں دنیا کی تمام لذّتیں ہیچ تھیں۔

ظاہر ہے حفظ ایک ترتیب سے چل رہا تھا۔ نماز میں امام صاحب کی قرات یا ویسے کسی سے ایسی آیات سنتا جن تک ابھی میرا سبق نہیں پہنچا تھا تو میں بے چین ہو جاتا اور سوچتا کب یہ آیات یاد کرنے کا موقع آئے گا، مثلاً

- سورۂ الزخرف کی آیت: وَ قِیْلِهٖ یٰرَبِّ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ
- سورۂ حجر کی آیت: رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِیْنَ
- سورۂ ہود کی آیت: قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ اٰتٰىنِیْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّیَتْ عَلَیْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَ اَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ
- اسی طرح بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا میں اِمالہ اور ءَاَعْجَمِیٌّ وَّ عَرَبِیٌّ میں تسہیل سے بہت حظ اٹھایا تھا۔

☆ آیاتِ رحمت کو مزے سے پڑھتا، آیاتِ عذاب سے بے چینی اور گھبراہٹ کی کیفیت ہو جاتی، کچھ سورتوں کا ذکر ہی مجھے بے چین کر دیتا، ان کو یاد کرنے کا شوق مجھے دیوانہ کر دیتا، مثلاً سورۃ النجم، سورۂ قٓ، سورۂ دخان۔ چند سورتیں میں نے ایک ہی دن اور کچھ ایک ہی نشست میں یاد کر لیں، جیسے سورۂ طٰہٰ، سورۂ مریم، سورۂ کہف، سورۃ الاسراء اور سورۂ یوسف۔ ہر سورت کا آغاز بہت ہی والہانہ انداز اور شوق سے کرتا اور دل میں یہ جستجو ہوتی کہ آگے آنے والی سورتیں کیسی ہوں گی۔ جب سورۃ المائدۃ مکمل کی اور اندازہ ہوا کہ اب صرف تین سورتیں باقی رہ گئی ہیں تو بجائے خوشی ہونے کے بہت غم رہنے لگا۔ نئی سورتیں نئی آیات یاد کرتے ہوئے جو لذت مل رہی تھی، اس کے چھوٹنے کا سوچ کر ہی اداسی سوار ہو جاتی۔ سورۃ البقرۃ یاد کرنے کے دوران میں اداسی اور غم نے خوشی اور شوق کو دبا ہی لیا، جان بوجھ کر حفظ کی رفتار سست کی۔ روز صرف ایک صفحہ یاد کرتا کہ کہیں جلدی ختم نہ ہو جائے کوشش رہتی کہ کسی نہ کسی طرح یہ سفر تھوڑا اور چلے۔۔۔ مگر وہ دن بھی آ گیا جو تکمیلِ قرآن کا دن تھا۔ وہ دن میری زندگی کے سخت ترین دنوں میں سے تھا۔ شیخ کو آخری سبق سنا کر قرآن مکمل کیا۔ ہر سو مبارکباد، ہر طرف سے دعائیں، لیکن اللہ گواہ ہے کہ میں اپنے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ حضرات کیا کہہ رہے ہیں، یہ شور شرابا کیسا ہے!

مجھے اُمِّ ایمن رضی اللہ عنہا کی بات یاد آئی جو انھوں نے اس وقت فرمائی تھی جب حضرت

ابو بکر صدیق و عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد ان کے گھر تشریف لے گئے تھے، کیوں کہ اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا کے گھر جانا نبی کریم ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی۔ جب دونوں حضرت ان کے پاس پہنچے تو وہ رونے لگیں۔ دونوں حضرات نے فرمایا کہ آپ کیوں رو رہی ہیں؟ اللہ جلّ جلالہ کے پاس اپنے رسول ﷺ کے لیے جو سامان ہے، وہ رسول اللہ ﷺ کے لیے بہتر ہے۔ اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں اس لیے نہیں روتی کہ یہ بات نہیں جانتی بلکہ اس وجہ سے روتی ہوں کہ اب آسمان سے وحی کا آنا بند ہو گیا۔ ان کی اس بات نے شیخین کو بھی رُلا دیا۔

اب قرآنِ کریم حفظ مکمل ہو چکا تھا، لیکن اسے پختہ سے پختہ تر کرنا تھا، اس لیے دہرائی شروع کی۔ روزانہ پانچ پارے دہراتا اور کبھی اس سے بھی زیادہ! جس روز عصر کے بعد امتحان ہونا تھا، میں نے فجر کے بعد سورۂ فاتحہ سے پڑھنا شروع کیا اور امتحان سے پہلے سورۃ الناس مکمل کر چکا تھا۔

اس دوران میں پتا چلا کہ ایک شیخ ایسے ہیں جو طالبِ علم انھیں پورا قرآن سنائے اس کو نبی کریم ﷺ تک اپنی متصل سند کی اجازت عطا فرما دیتے ہیں۔ میں ان کی خدمت میں پہنچا، قرات کی اجازت چاہی۔ انھوں نے خوش دلی سے اجازت مرحمت فرمائی، اگرچہ ان کے پاس طلبہ کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ روزانہ انھیں سنانے لگا، جس روز سورۂ انعام سنانا تھی اتفاق سے ان کے پاس اور کوئی نہیں تھا تو میں نے ایک ہی نشست میں پوری سورۃ الانعام سنا دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سورت بھی اُن سورتوں میں سے ہے جو پوری ایک ہی دفعہ میں نازل ہوئی تھیں۔۔۔ دل خوش بھی بہت ہوا اور بار بار یہ خیال بھی آتا کاش! حفظ کرتے وقت یہ بات پتا ہوتی تو پوری سورت یاد بھی ایک ساتھ ہی کرتا۔

اس دوران میں بڑا عجیب واقعہ ہوا۔ انہی شیخ کو ایک اور صاحب بھی قرآن سنایا کرتے تھے، بڑے نیک سیرت، خوش اخلاق، دھیمی آواز سے قرات کرتے۔ ایک دن میں نے ان کی قرات توجہ سے سنی تو حیرت ہونے لگی، وہ کئی جگہ غلطیاں کر رہے تھے۔ زیادہ تعجب اور حیرت اس پر تھی کہ شیخ سنتے جا رہے تھے کوئی تنبیہ نہیں کر رہے تھے، نہ ہی کہیں ٹوک رہے تھے، جب وہ سنا کر فارغ ہوئے تو پتا چلا کہ یہ غلطی نہیں بلکہ نافع کی قالون والی روایت ہے۔ اس کے ساتھ ہی شیخ نے دوسری قراتوں کا بھی مختصر تعارف کروایا۔

یہ سن میں خوشی سے نہال ہو گیا، آنے والی رات میرے لیے بہت سکون اور اطمینان کی رات تھی۔ نیا سبق یاد کرنے کی جو خوشی ملنا بند ہو گئی تھی، گویا وہ موقع دوبارہ چلا آیا تھا، یعنی میں نے دوسری قرات سیکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یہ خوشی و مسرّت اسی کا نتیجہ تھی۔ قرأت سیکھنے کا دور شروع ہوا۔ پانچ ماہ میں شیخ کے سامنے قراتِ حفص مکمل کی، جبکہ عموماً طلبہ آٹھ ماہ میں مکمل کیا کرتے تھے، لیکن شیخ نے کرم کیا، وقت بھی دیا توجّہ بھی دی اور دعائیں بھی۔ اس کے بعد ورش عن نافع والی سند کی قرات شروع کی۔ الحمد للہ! یہ قرات تین ماہ میں مکمل ہوئی۔ اس کے بعد قالون عن نافع والی روایت، یہ قرات دو ماہ میں مکمل ہوئی۔

شیخ نے بتایا کہ انھوں نے صرف یہی تین روایتیں پڑھی ہیں۔ انھوں نے میری ایک ایسے شیخ کی طرف رہنمائی کی جو قصرِ منفصل کے ساتھ حفص کی روایت کو پڑھاتے تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے قرأت کی اجازت چاہی تو خوشی سے اجازت دی۔ ان سے پڑھنا شروع کیا تو پتا چلا شیخ مفسّرِ قرآن بھی ہیں اور فقہ کے بھی بڑے عالم ہیں۔ تلاوت سن کر انھیں بارہا اشکبار دیکھا۔ ان کی شاگردی پانچ ماہ جاری رہی، گو اس کے بعد بھی میں ان کی مجلس میں شریک رہتا۔ وہ کچھ آیات کی تفسیر کرتے تھے۔ اللہ نے اِن سے مجھے بے حد فائدہ پہنچایا۔ پانچ ماہ میں ان کے ساتھ تکمیلِ قرآن ہوئی، خدا کی قسم! میری آرزو تھی کہ یہ مدّت طویل ہو جاتی۔

جن استاذ اور شیخ سے میں نے قرآن حفظ کیا تھا، انھوں نے اپنے استاذ کا تعارف کروایا۔ وہ مدینہ منورہ کے جلیل القدر قرّا میں سے تھے۔ حرمین شریفین کے متعدد ائمہ حضرات نے ان سے قرات کی سند حاصل کی تھی۔ وہ عظیم الشان وضع قطع کی حامل شخصیت اور صاحبِ ہیبت اور وقعت تھے۔

میں ان کے پاس حاضر ہوا اور قرات کی اجازت چاہی تو انھوں نے بخوشی اجازت دے دی۔ ان کے پاس میں نے ابو عمرو البصری کی قرأت سے آغاز کیا۔ اللہ تعالیٰ نے شیخ کے دل میں میری محبت ڈال دی، انھوں نے مجھے اپنے دوسرے شاگردوں پر فوقیت دی۔ وہ روزانہ سات صفحات پڑھتے تھے اور میں نو یا دس یا اس سے بھی زیادہ! بلند آواز سے پڑھتا اور خوب ترتیل کے ساتھ ادا کرتا۔ یہ چار ماہ میں مکمل ہوئی۔۔۔ پھر ورش کی روایت بھی پوری پڑھ لی، پھر شیخ سے درخواست کی کہ قالون کی روایت کے ساتھ ابنِ کثیر کی قرات بھی جمع کر لوں؟ انھوں نے وہ بھی کروا دی۔۔۔ پھر باقی دس مشہور قرأتیں ترتیب سے پڑھیں۔ یہ قرات تعطیلات سمیت چار سال سے کم مدّت میں مکمل کیں، ہر قرأت میں اوسطاً چار ماہ لگے ہوں گے۔ شیخ کا فرمانا تھا: پچاس سال کے دوران میں، مَیں ان کا سب سے تیز رفتار شاگرد ہوں۔

اب بحمد اللہ تعالیٰ میری کوشش یہ ہے کہ ہر سات دن میں قرآن ختم کروں، ہر ختم کسی روایت یا قرات سے۔ خدا کی قسم! جب بھی ایک قرآن شروع کرتا ہوں تو دوسرے کی آرزو جاگ اٹھتی ہے اور جو سورت بھی پڑھتا ہوں اسی شوق سے پڑھتا ہوں اور وہی لذّت محسوس ہوتی ہے، جس سے حفظ کیا تھا۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہمارے گناہوں اور ہماری کوتاہیوں کے سبب ہمیں اس کی برکات سے محروم نہ فرمائے، ہمیشہ اسی ذوق و شوق سے اپنے پاک کلام کی تلاوت کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!!

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ

کہہ دیجیے! (یہ سب کچھ) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کے باعث ہے، پس مسلمانوں کو چاہیے کہ اس پر خوشیاں منائیں، یہ اس (سارے مال و دولت) سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔

نارنگی کے فائدے

حکیم شمیم احمد

تعارف

نارنگی کو ہندی میں نورنگی، بنگالی میں نارنگالیبو اور انگریزی میں Orange کہتے ہیں۔ نباتاتی نام CitrusSinenis ہے۔ یہ Rutaceae سے تعلق رکھتا ہے۔ موسمی، مالٹا، کینوں، لیموں، گریپ فروٹ اسی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی جائے پیدائش مشرقی ایشیا ہے۔ وہاں سے نکل کر اب یہ ساری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ سرد علاقوں میں یہ سبزی مائل اور گرم علاقوں میں مکمل اورنج رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ نارنگی ایک مشہور، خوب صورت اور مزیدار پھل ہے۔ سنگترے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ بعض نے نارنگی کو نارنج کا نام دیا ہے۔ نارنگی سنگترہ اور کینوں سے چھوٹی ہوتی ہے۔ اس کا چھلکا پتلا اور چھوٹا ہے۔ یہ شیریں اور ترش دو قسم کی ہوتی ہے۔ اورنج کو سب سے پہلے عربوں نے یورپ میں متعارف کروایا، پھر بعد میں اسپین میں اس کی باقاعدہ کاشت کاری شروع کی گئی۔

جدید تحقیق

جدید تحقیق کی رو سے ڈاکٹر (lackraik) ڈاکٹر ماری اور دیگر تحقیق دانوں نے اورنج کو مقوی معدہ، دافع تشنج، دافع بلغم، گیس اور ریاحی و بادی امراض، زیادہ کھانے کی بدہضمی اور قبض کا بہترین علاج بتایا ہے۔

اورنج کے طبّی افعال

جامع تحقیق سب سے پہلے عربوں نے کی، پھر سولہویں صدی تک اس پر مزید کوئی کام نہ ہوا۔ فرانس اور یورپ میں اس پر زیادہ کام یوں بھی نہ ہوسکا کہ یورپ میں یہ ایک گراں قیمت پھل تھا، بلکہ بعض علاقوں میں اس قدر مہنگا تھا کہ کرسمس اور دیگر تہواروں میں لوگ اس کو بطورِ تحفہ بھیجا کرتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں اس پر کچھ کام ہوا، جب اورنج یورپ میں منوں کے حساب سے پیدا ہونے لگا۔ اس وقت بھی عربوں نے ہی پیداوار کو آگے بڑھایا۔ اس کو مالیخولیا، سوداکی زیادتی، دل کے امراض، دمہ، سانس کے امراض، پیٹ اور سینے کے امراض، سمندری سفر کے دوران آنے والے چکروں، زچگی کی قے اور گرمی کے امراض کے لیے مفید و کارآمد پایا گیا۔ بے شمار گھریلو ٹوٹکوں میں بھی اورنج جوس کا استعمال کیا جانے لگا ہے۔

نارنگی اعصابی نظام کے لیے ٹانک

نارنگی جس طرح تازہ پھل فائدہ مند ہے، اسی طرح اس کا OrangeSweetOil اور OrangePetitGrainOil بھی کارآمد ہے۔ یہ جسم اور اعصابی نظام کے لیے ٹانک کا کام کرتا ہے۔ یہ ایگزیما، دانے، پھوڑے پھنسی اور تقریباً تمام جلدی امراض میں فائدہ مند ہے۔ اورنج جلد کی تازگی برقرار رکھتا ہے اور جلد مرجھانے کی صورت میں اس کے چھلکے کو منہ پر ملنا فائدہ مند ہے۔ اگر جلد حساس ہے تو جلن ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اگر جلد میں جلن ہوجائے یا جلد سرخ ہوجائے تو اورنج کا استعمال نہ کریں بلکہ اورنج جوس سے منہ کو دھو کر خشک کرلیں، پھر تازہ پانی سے دھولیں۔ چہرے کی جھریوں کے لیے بھی یہ نسخہ بہترین ہے۔

اورنج کی قدیم تاریخ

قدیم رومی بھی اورنج کے فوائد سے واقف تھے۔ ان کی کتابوں میں اس پودے کی نشوونما و حفاظت کے بارے میں واضح ہدایت موجود ہے۔ رومی اس کو نشے کے اثرات بد سے بچنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ زیادہ نشے کی وجہ سے ہونے والی قے کی صورت میں تازہ اورنج کا جوس پینے کی ہدایت دی جاتی۔

1920ء میں برطانیہ کے ایک لینڈ لارڈ نے اس کو اسپین سے درآمد کرکے اس کی باقاعدہ کاشتکاری شروع کی۔

1439ء میں فلوریڈا کے مقام پر اس کی کاشتکاری کا آغاز کیا گیا اور اب پوری دنیا میں سب سے زیادہ فلوریڈا میں ہی اس کی پیداوار ہوتی ہے۔ اب اورنج بلا مبالغہ پوری دنیا میں باقاعدہ کاشت کیا جاتا ہے۔

1493ء میں کرسٹوفر کولمبس نے اورنج کو امریکا میں متعارف کروایا اور ہسپانی لیا پر اس کی باقاعدہ کاشتکاری کا اہتمام کیا۔

اورنج پیٹ کی بیماریوں کا کافی وافی علاج

اورنج زود ہضم مفرح اور طاقت بخش ہے۔ گرمی، پیاس کی زیادتی، فسادِ خون، بدہضمی، متلی اور جگر کی گرمی کے بخار میں بھی مفید ہے۔ بڑا گوشت کھانے کے بعد اکثر لوگ بدہضمی اور پیٹ کی خرابی کا شکار ہوجاتے ہیں، اس وقت دو یا تین اورنج کھائیں یا اس کا جوس پییں یہ عمل تین دن جاری رکھیں موسمی، مالٹے، کینوں، اورنج کا جوس پییں۔ اس سے نہ صرف پیٹ کے تمام امراض دور ہوجائیں گے بلکہ بے حد چستی حاصل ہوگی۔

احتیاط: یادرہے، جب بھی اورنج، مالٹا، موسمی یا کینوں کا جوس پییں تو تازہ پییں۔ ترشی ہو تو سیاہ مرچ اور سیاہ نمک معمولی مقدار میں شامل کرلیں۔ منہ کی بدبو دانتوں یا مسوڑھوں سے خون کا آنا اور منہ کے اندر چھالوں جیسے عوارضات کے لیے ایک کپ نیم گرم پانی میں دو یا تین قطرے اورنج آئل ملا کر دن میں تین سے چار مرتبہ کلی اور غرارے کریں۔

بقیہ صفحہ نمبر 29 پر

عالمی ادارہ

بیت السلام

ویلفیئر ٹرسٹ

BAITUSSALAM

2200+

یتیم بچے زیرِ کفالت

رہائش، خوراک، تعلیم و تربیت

بنتِ ایوب مریم

تربیتِ شوہراں

تربیت! یہ لفظ پڑھ کر ذہن جس مرکب پہ ٹھہرتا ہے، وہ ہے: بچوں کی تربیت۔ آپ نے کبھی لکھا نہیں پڑھا ہوگا کہ والدین کی تربیت، بیوی کی تربیت، شوہر کی تربیت یا ساس وسسر کی تربیت۔ تربیت کا مطلب یہی ہے نا کہ سدھارنا، سکھانا یا اصلاح کرنا تو کیا ہم سب مکمل اصلاح زدگان ہیں؟

دورِ جدید میں بچوں کی نفسیات کے مطابق ڈھلنے اور بوڑھوں کے بدلتے مزاج کے مطابق ان سے خندہ پیشانی سے نبٹنے کے لیے بہت کچھ ساتھ ساتھ نیا سیکھنا پڑتا ہے۔ آپ گزشتہ سالوں میں پلنے والے بچوں کو آج کے بچوں پہ بالکل قیاس نہیں کر سکتے، کیوں کہ وقت، حالات اور تقاضے سب بدل چکے ہوتے ہیں۔ اسی لیے تربیت کی ہم سب کو ہمہ وقت ضرورت رہتی ہے یا ہر انسان لحد کی گہرائی میں اترنے تک زیرِ تربیت رہتا ہے۔

اگر آپ ایک ماں ہیں تو بیٹا اور بیٹی دونوں کو تربیت دیجیے۔ انھیں بیاہنے کا وقت آئے تو بھی دونوں کو زندگی کی آزمائشوں اور حالات کے اتار چڑھاؤ سے آگاہی دیجیے۔ اگر بیٹی کو امورِ خانہ داری کے ساتھ سلیقہ اور ہنر سکھا رہی ہیں تو بیٹے کو بھی اتنا ضرور سکھلا دیجیے کہ کل آنے والی آپ کے بچے کے ہاتھوں سکھ پائے۔

اسلامی طرز کے مطابق گھریلو امور کی تقسیم میں بہت آسانی اور برکت رہتی ہے کہ مرد کو پکا پکایا میسر آجاتا ہے اور بیوی کو فکرِ معاش میں باہر کی صعوبتیں نہیں جھیلنا پڑتیں، لیکن مرد نے کبھی یہ سوچا کہ انھیں ہفتہ وار چھٹی ہوتی ہے، عید کے تہوار اور کئی مزید تعطیلات عام ہیں اور آپ کی بیوی کو کچن کے کاموں سے کبھی فرصت نہیں ملی، بچوں کو سنبھالنے سے کوئی لمحہ فارغ نہیں پایا، بلکہ آپ کے تہوار اور خوشی کے سارے رنگ بھی اسی کے سنگ ہوتے ہیں کہ وہ آپ اور بچوں کے لیے نِت نئے کھانے بناتی اور کپڑے تیار کرتی ہے۔

آپ نے کبھی آگے بڑھ کر اُسے اس کی جزا دی؟ یا صرف آپ اور بچوں کی خوشی سے ہی وہ اپنی ساری تھکن بھول جاتی ہے۔ بیوی بیمار ہوئی تو اس نے اپنے لیے پرہیزی کھانا بھی خود ہی بنایا، بچے کو خود ہی سنبھالا۔۔۔ میرے نزدیک یہ بیوی کے جذبات اور محبت کا سنگین قتل ہے۔ اگر وہ آپ کا ہر طرح سے خیال رکھتی ہے تو آپ باہر سے کما کر لا کے دینے میں ہی بَری الذّمہ ہو جاتے ہیں؟

اس کے علاوہ بیمار بیوی کی ذمے داری مرد کو اپنی ماں یا بہن کو سونپتے دیکھا ہے۔ جب کہ یہ بھی مرد کی خود داری اور غیرت کا تقاضا ہے کہ جو اس کے ساتھ اپنا جیون بانٹتی ہے، مشکل حالات میں اسے خود سنبھالے۔ ہاں، مجبوری میں یا کچھ وقت کے لیے کسی اور کو مقرّر کر دیں ٹھیک ہے، لیکن اپنی ذمہ داری خود ہی نبھانی چاہیے۔ اس لیے آج اگر آپ بیٹی سے یہ کہتی ہیں کہ جو سبزی آپ خود نہیں کھاتی، لیکن بنانا ضرور سیکھے کہ اگر اس کے سسرال میں انھیں وہی کھانا پڑ جائے۔ ہر کام سیکھا جائے کہ کوئی ہنر بے کار نہیں جاتا، شوہر اور بچوں کے کم از کم ادھڑے پھٹے کپڑے ٹھیک کر سکو، یہ بجا ہے! لیکن بیٹے کو بھی کچن سے اتنی آشنائی ضرور کروا دیں کہ بیوی کے نازک وقت میں کام آسکے۔ چولہا جلا کر چائے بنا سکے، کم از کم انڈا ہی اُبال سکے یا یخنی بنا سکے۔

اب مائیں بیٹیوں کو تو سگھڑ، سلیقہ مند اور ہر فن مولا بنا کر رخصت کر دیتی ہیں، لیکن بیٹے کا حال یہ ہے کہ امورِ خانہ داری میں ہاتھ بٹانا تو در کنار، اسے اپنی ذمے داریوں کا فہم تک نہیں ہوتا۔ اب بہو چڑ رہی ہے کہ موصوف کو اچھا سودا تک لانا نہیں آتا، بازار میں کسی شے کا پتا نہیں ہے۔ وہی لڑکپن کی عادت کہ سوئے تاخیر سے اُٹھے یا کوئی ضرورت کی چیز لانا ہو تو روز ہی بھول جائے۔ اب ساس طرف داری کرے کہ بیٹے کو پریشان نہیں کرنا، جس شے کی ضرورت ہے ہمیں بتانا ہے۔ یہ شکایت دیکھی جاتی ہے کہ کچھ مائیں بیاہنے کے بعد بھی بیٹے کو ذمہ دار نہیں بننے دیتیں، حالاں کہ اگر آپ ساس ہیں تو کیا ساری زندگی آپ کو بہو کے ساتھ رہنا ہے یا آپ کے بیٹے کو۔؟ یہی اچھا نہیں تھا کہ بیٹی کے ساتھ ساتھ آپ بیٹے کو بھی زندگی کا کچھ ڈھنگ سکھا دیتیں۔

اس رویے پر ضرور غور کرنا چاہیے کہ ایک خاتون کے لیے اپنا بیٹا ہمیشہ بچہ لگے اور اس سے برتاؤ یہی رہے، لیکن نئے گھر سے آنے والی بیس بائیس سالہ لڑکی میں پورے چالیس سال

انیسہ عائش

چھوٹا لڑکا بڑی سوچ

”عبیدان جیسے چھوٹے لوگوں کی سوچ بھی چھوٹی ہوتی ہے۔بڑے لالچی ہوتے ہیں، ٹکے ٹکے پر بک جاتے ہیں۔میں تو کہتا ہوں اچھی طرح سے سوچ لو تم۔“ ارسلان صاحب کے لہجے میں حقارت تھی۔

”نہیں، وہ لڑکا ایسا نہیں ہے۔عادات انسان کا پتا دیتی ہیں۔دوسرا وہ طالبِ علم ہے۔ علم انسان کو شعور دیتا ہے، سوچ کو وسیع کرتا ہے۔اس کی سوچ چھوٹی نہیں ہو گی۔“

”کیوں نہ ایک بار آزما کر دیکھ لو؟ یہ میرا مشورہ ہے۔“ عبید صدیقی صاحب پُر سوچ انداز میں سامنے رکھی میز کو تک رہے تھے۔

عبید صدیقی صاحب ایک کاروباری آدمی تھے۔ ان کے بعد ان کے بیٹوں نے ان کے کاروبار کو وسعت دے کر باہر کے ممالک تک جا پھیلایا تھا اور اب کئی سالوں سے وہیں مقیم تھے۔ وہ اپنے والد کو بھی اپنے ساتھ رکھنے پر بضد تھے، مگر صدیقی صاحب اپنی مٹی، اپنا ملک چھوڑنے کو تیار نہ ہوتے تھے، چناں چہ پوش علاقے میں ان کے لیے بنگلہ تیار کروا دیا گیا، جس میں نوکروں کی ایک فوج خدمت کے لیے موجود تھی۔ وہ اپنے بچوں سے ملنے جاتے تو ہر کوئی نے حد اصرار کرتا اپنے ہاں ٹھہرانا چاہتا، انھیں وہیں سیٹل ہونے کے حق میں دلائل دیے جاتے، مگر وہ چند ماہ بعد ہی واپسی کی راہ پکڑتے۔ یہاں ان کی زندگی پُر سکون گزر رہی تھی۔ وہ ملازمین پر خاصے مہربان تھے۔ کھانے پینے کی اشیا وافر مقدار میں ہوتی تھیں تو انھوں نے ملازمین کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ ضرورت کے مطابق لے جاسکتے ہیں۔ ملازمین اس مہربانی کا خوب فائدہ اٹھاتے۔ ہر کوئی شاپر بھر کر لے جاتا، اس کے علاوہ بھی کوئی نہ کوئی چیز ضرورت بیان

کر کے لے جاتے۔ کچھ نے تو حد ہی کر دی تھی، وہ مالک کی چھوٹی موٹی الیکٹرونکس کی چیزیں اور مشینیں جیسے جوسر، استری وغیرہ تک غائب کرنے لگے تھے۔ یہ سب صدیقی صاحب کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہتا تھا۔ یہ دیکھ کر ان کا دل دُکھتا تھا، مگر وہ خاموش تھے کہ چلو ان کے رزق کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ اس بار جب سے وہ انگلینڈ سے واپس لوٹے تھے، ان کی دل چسپی کا محور نیا ملازم ارمان تھا۔ مالی بابا کی سفارش پر انھوں نے ارمان کو رکھا تھا۔ پہلی نظر میں ہی انھیں یہ لڑکا مختلف سا محسوس ہوا تھا۔ اس کا تعلق دور دراز کے ایک گاؤں سے تھا۔ ضرورت اسے یہاں تک کھینچ لائی۔ انھوں نے اسے بنگلے کے بستر، چادروں اور پردوں کے بدلنے کا انتظام سونپ دیا۔ ارمان تندہی سے اپنا کام نمٹاتا۔ فارغ ہوتے ہی اپنی کتابیں لے کر لان کے پچھلے حصے میں جا بیٹھتا۔ بقیہ سارا دن وہ وہاں کتابیں پڑھتے گزارتا۔ نوجوان مطالعے کا بھی شوقین معلوم ہوتا تھا۔ کم گو، کام سے کام رکھنے والا، خود میں مگن، صدیقی صاحب اس سے متاثر ہو گئے تھے۔ اسے یہاں کام کرتے پانچ چھ ماہ ہونے کو آئے تھے، مگر انھوں نے اسے دوسرے ملازمین کی طرح چیزیں لے جاتے، ہاتھ پھیلاتے نہیں پایا تھا۔ انھیں بہت حیرت ہوتی جب اسے دیکھتے کہ ارمان اپنے لیے کھانا بھی اتنا سا نکالتا جتنا کھا سکے، باقی من و سلویٰ کے ڈھیر سے اسے کوئی رغبت نہ ہوتی۔ بہت دنوں سے وہ ملازمین پر نگران مقرر کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اب انھیں اپنی سوچ کا سرا مل گیا۔ کمرے کی کھڑکی سے نیچے بیٹھے ارمان کو اپنی نظروں کے ترازو میں تولتے، وہ اک نتیجے پر جا پہنچے۔ اسی بات کا مشورہ کرنے کے لیے وہ اپنے قریبی دوست ارسلان صاحب کے پاس چلے آئے تھے۔

صدیقی صاحب نے ایک نظر میز اور صوفے پر بے ترتیب بکھرے پیسوں پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ کمرے کی مشرقی دیوار کی طرف آ کر ارسلان صاحب کو میسج کیا۔ یہ دیوار مکمل طور پر شیشے کی بنی ہوئی تھی۔ اس کونے میں بڑے بڑے دیوار گیر گملے رکھے گئے تھے۔ اندر سے دیکھے جانے پر یہاں کھڑے شخص کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ اچانک کندھے پر لمس محسوس ہونے پر پلٹے۔ ارسلان صاحب کو دیکھ کر خیر مقدمی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کو آ چھوا۔ دونوں نے نظریں اندر کے منظر پر گاڑھ دیں۔ اسی دَم دروازہ کھلا اور ارمان اندر داخل ہوا۔ اس کی نظر پیسوں

پر پڑی۔ وہ قدم قدم چلتا ہوا میز کی جانب بڑھنے لگا۔ ارسلان صاحب کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیلتی جارہی تھی۔ ادھر ارمان کے ہر بڑھتے قدم کے ساتھ صدیقی صاحب کا دل ڈوبتا جارہا تھا۔ ارمان صوفے کے پاس جا کر رک گیا۔ چند لمحے وہ ان کو دیکھتا رہا، پھر اس نے جیسے ہی ہاتھ صوفے کی طرف بڑھایا، صدیقی صاحب کا دل یک بارگی دھڑک اٹھا۔ ارمان نے صوفے پر پڑی نوٹوں کی گڈی کو اُٹھا کر بڑے صاحب کی میز کی دراز میں رکھا اور صوفے کا کَور بدلنے لگا، پھر اپنا کام مکمل کرتا رہا۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ صدیقی صاحب نے فخریہ ارسلان صاحب کی طرف دیکھا، جن کے چہرے پر غیر متوقع بے یقینی کے تاثرات تھے۔ ان کے ذہن میں اپنے کہے گئے الفاظ گونج رہے تھے۔ یہ چھوٹے لوگ ٹکے ٹکے پر مرنے والے ہوتے ہیں۔۔۔ جبکہ ارمان نے نوٹوں کی گڈیوں پر دوسری نگاہ بھی ڈالنا گوارا نہیں کیا تھا۔ حقیقت میں تو آج اس چھوٹے لڑکے نے ان کی چھوٹی ذہنیت کو آشکار کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے غریب لوگوں کو اپنے سے کم تر سمجھتے اور حقارت کی نظر سے دیکھتے آئے تھے۔ عبید صدیقی صاحب ان کے چہرے پر ندامت کی تاریکی کو پھیلتے دیکھ رہے تھے۔

سالوں پرانے ملازم حیران تھے، کچھ حسد اور کچھ رشک کناں کہ چار دن کا آیا یہ چھوٹا سا لڑکا ان پر نگران کیسے بنادیا گیا۔ ارمان کو نگران مقرر کر کے صدیقی صاحب کو اپنا آپ مطمئن محسوس ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ سے کہتے آئے تھے، انسان روپے پیسے کی بدولت چھوٹا بڑا نہیں ہوتا، کردار کی بلندی ثابت کرتی ہے کہ کون سا انسان چھوٹا کہلائے جانے کے لائق ہے اور کون بڑا۔۔۔ وہ خوشی محسوس کر رہے تھے کہ بالآخر اس چھوٹے لڑکے نے ان کے قول کو معتبر کر دیا تھا۔

بقیہ

تربیتِ شوہراں

والا سگھڑاپا اور سلیقہ ہونا چاہیے۔ عموماً دیکھا یہی جاتا ہے کہ ماں کے لیے اپنا بیٹا ہمیشہ بچہ رہتا ہے تو اسی طرح اس کے لیے ممتا کا سیلاب بھی کبھی نہیں رُکتا۔ بہو کے حق میں بیٹے کی کوتاہی کبھی نظر نہیں آئے گی، لیکن یہ خیال ضرور رہے گا کہ بہو بیٹے کا کتنا خیال رکھ رہی ہے، کیا پکا کر کھلا رہی ہے۔ وہی گھر کی سبزی، دال و گوشت ہی کھلا رہی ہے نا جو وہ بچپن سے کھاتا آرہا ہے۔ کھانا باہر سے تو نہیں آرہا؟ یا باہر کھانے تو نہیں جا رہے؟

اگر ناشتہ تاخیر سے کرنے نہ کرنے یا باہر سے کرنے پہ ہر چند دنوں بعد آپ یہ کہیں کہ مجھے بتانا تھا۔۔۔ ناشتہ میں بنا دیتی یا گھر سے دور ہوں تو فکر ستائے کہ بیٹا روٹی نجانے کھاتا ہو گا یا نہیں۔۔۔ تو یہ آپ غلط جگہ ممتا استعمال کر رہی ہیں۔ سوچنا چاہیے، یہ رویہ کہیں ممتا کی آڑ میں ایک ازدواجی تعلق میں دراڑ تو نہیں ڈال رہا۔ اگر بیٹے کی ذمے داری آپ نے نئی آنے والی کے ہاتھ میں سونپ دی ہے تو اسے خود بھی قبول کریں۔ اس معاملے کو اس پہلو سے سوچنا اور سمجھنا شاید بہتر ہو کہ اگر بہو کے ماں باپ اسے فون کر کے پوچھیں: میری بیٹی کو فلاں شے کی ضرورت تو نہیں یا نہ جانے کسی نے لا کر دی ہو گی یا نہیں! بیٹی بیمار ہے تو نجانے کسی نے دوا دلائی ہو یا نہیں۔۔۔! اگر بہو کی ماں یوں کریں تو یقیناً اسے اچھا نہیں سمجھا جائے گا۔ اگر بیٹا ماں کے لیے بچہ ہے تو بہو بطور بیٹی میکے میں نجانے کتنے لاڈ اُٹھوا کر آتی ہے۔ گھر بھر کی لاڈلی ہوتی ہے۔ جیسے آپ یا اس کے والدین شادی کے بعد بیٹیوں کے معاملات میں نہیں پڑتے، ایسے ہی خدارا بیٹوں کی زندگی میں بھی مت دخل دیا کریں یا ہماری عورتوں کو یہ فکر بھی ہر وقت دامن گیر رہتی ہے کہ بیٹا کیا کما رہا ہے اور بہو کیا خرچ کر رہی ہے، یہ سراسر زیادتی ہے۔

آپ ایک بیٹی ہیں، ماں یا بہو۔۔۔! اصول بنالیں کہ ساس یا بہو کی ضرورت سے زائد جہاں آپ کو محسوس ہو کہ دوسرا خوش یا مطمئن نہیں ہے، کبھی مدد نہ کریں۔ دوسرے کے لیے اتنا ہی کریں جتنا وہ خوش دلی سے کروانا چاہے۔ بیوی ہیں تو گھر میں کبھی بھی لگائی بجھائی نہ کریں کہ ساس کی بات میاں کو اور میاں کی بات ساس کو بتائی۔ گھر کا ماحول خوش گوار بنائے رکھنا ایک حد تک آپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

شادی میں محبت اور پیار پہلے پہل ہی چلتا ہے، اس کے بعد ثانوی حیثیت اختیار کرتے ہوئے فوقیت عزت اور ذمہ داری کو دی جاتی ہے۔ مردوں کو بھی چاہیے کہ جب شادی کی ہے تو بطورِ شوہر اپنی ذمے داری پوری کریں، جہاں اسے اپنی اور دوسرے رشتے داروں عزیزوں کی عزت پیاری ہوتی ہے، وہیں اپنی بیوی کو بھی عزت دینا اور دلانا یاد رکھیں۔۔۔! یہ صحیح ہے کہ عورت کو عموماً عادت ہوتی ہے، ایک کی دو بڑھا کر بات بتانے کی، لیکن پھر بھی جب وہ اپنا دکھ روئے تو مرد کو سننا آتا ہو، تسلی دینا آتی ہو، ڈھال بننا آتا ہو نہ کہ وہ مزید کم زور پڑ کر عورت کو بھی پچھتانے پہ مجبور کرے کہ زندگی کے سیلابِ بلا کی ڈور کس مرد کے ہاتھ میں ہے۔

صنفِ نازک تو ہے ہی۔ نازک آبگینہ! کہ اگر یہ کرچی کرچی ہو جائے تو آپ تاحیات اس میں اپنی مکمل تصویر نہیں دیکھ سکتے۔ عورت کو تحفظ کا احساس مرد ہی دلاتا ہے کہ اس کا وقت اور کردار اس کے لیے کس قدر اہم ہے۔ اب آپ سوچ رہی ہوں گی کہ اس میں کئی باتیں ایسی ہیں جو مردوں کو براہِ راست سمجھانی چاہییں، جب کہ انھیں گوشۂ خواتین میں شائع کر دیا گیا ہے۔ تو میری پیاری بہنو! بیٹے کے روپ میں یہ مرد آپ کے زیرِ تربیت بھی تو ہے نا، شوہر ہاتھ نہیں بٹاتا تو پیار سے سمجھایئے، لیکن بیٹے کی ایسی نہج پہ تربیت کریں کہ کل آنے والی آپ کو دعائیں دیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اپنے دین کے مطابق تربیت کرنے میں آسانی فرمائے۔ آمین!!

BAITUSSALAM LABORATORY & DIAGNOSTIC CENTRE

Laboratory

X-Ray

OPD

Dental Care

Eye Care

Ultra Sound & Color doppler

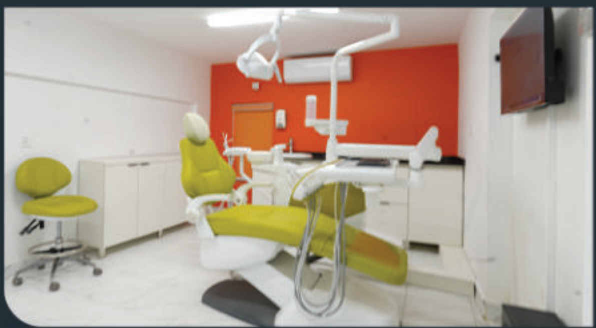

+92 21 35392634 +92 334 2982988 lab@baitussalam.org

مؤمنہ

اُم محمد سلمان

شگفتہ ہماری بہت اچھی پڑوسن ہے۔ ابھی کچھ ماہ پہلے ہی ہمارے محلے میں شفٹ ہوئی ہے۔ ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے رکھا ہے۔ سانولی رنگت پُرکشش چہرہ، تیس پینتیس کے درمیان عمر ہوگی۔ بہت ہنس مکھ اور دھیمے مزاج کی ہے۔ اکثر ملنے آجاتی ہے۔ باتیں بہت اچھی کرتی ہے۔ کبھی تو ایسا لگتا ہے کوئی پہنچی ہوئی شخصیت ہے۔

اس کے بہت بلانے پر ایک دن میں بھی اس کے گھر چلی گئی۔ وہ تو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی، لیکن میں خوش نہیں ہو سکی۔ بہت چھوٹا سا گھر تھا۔ ایک کمرہ، کمرے سے ملحق ایک تنگ سا غسل خانہ، برائے نام صحن اور اس میں ایک طرف رکھا ہوا چولہا اور دو چار مسالوں کے ڈبے۔۔۔ کمرے میں ایک طرف پڑی چارپائی اور ایک ٹوٹی پھوٹی سی لکڑی کی الماری، چھت سے لٹکتا ایک پرانا سا پنکھا۔۔۔ بس یہی اس کا کل ساز و سامان تھا۔

میرے لاکھ منع کرنے پر بھی چائے بنا کر لے آئی۔ چائے کا ذائقہ اور رنگ بہت اچھا تھا، شاید اس کی محبت اور خلوص نے چائے میں رنگ بھر دیے تھے۔ میں کچھ دیر بیٹھی اور چلی آئی۔

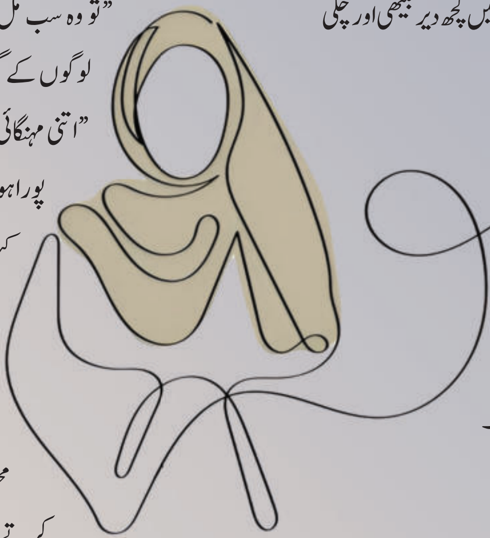

پھر دوبارہ جب وہ میرے پاس آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔۔۔

"تمہارا میاں کیا کام کرتا ہے شگفتہ؟"

"آپی! وہ فوڈ پانڈا میں ڈیلیوری بوائے ہے۔"

"تنخواہ کیا ملتی ہے؟"

"بیس ہزار دیتے ہیں!"

"بیس ہزار میں کیسے گزارا ہوتا ہے شگفتہ؟ تمہارا تو مکان بھی کرائے کا ہے، آٹھ ہزار کرائے کے دیتی ہو، دو تین ہزار گیس بجلی کے بل میں چلے جاتے ہیں، دونوں بچے بھی اسکول پڑھتے ہیں۔ ٹیوشن بھی جاتے ہیں۔ گھر کے سو خرچے، دکھ بیماری، مہمان داری۔۔۔ سب کیسے کر لیتی ہو؟"

"بس آپی ہو جاتا ہے، اللہ سب کروا دیتا ہے۔"

"لیکن کیسے۔۔۔؟ کیسے سب ہو جاتا ہے؟" میں حیران بھی تھی اور پریشان بھی۔

وہ زور سے ہنس پڑی، پھر کسی پرانی فلمی ہیروئن کی طرح دوپٹے کا پلو منہ میں دبا کے ذرا سا شرما کے بولی۔۔۔ آپی! پچھلے دو سال سے میں تین چار گھروں میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہوں۔ لیکن آپ گلی میں کسی کو بتائیے گا نہیں، پلیز۔۔۔! اس کی آنکھوں میں التجا سی تھی۔

"ارے تم محنت کرتی ہو، حلال کماتی ہو! بھلا اس میں شرم کیسی؟ کیوں چھپاتی ہو کسی سے؟"

"بس آپی! مجھے خود عجیب سا لگتا ہے۔ کوئی بھی عزت دار عورت اس طرح گھر سے باہر نکلنے میں شرم محسوس کرتی ہے تو بس مجھے بھی شرم آتی ہے۔ پتا ہے آپی! میں ایک بہت اچھے گھرانے سے ہوں۔ ہمارے گھر میں سب لوگ بہت اچھے اخلاق والے اور تمیز دار ہیں۔ کوئی کسی سے اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتا۔ میرے ابو جی کا انتقال ہو گیا۔ اللہ جنت نصیب کرے، وہ بہت ہی اچھے انسان تھے۔"

"میکہ کہاں ہے تمہارا؟"

"میرا میکہ نوشہرہ میں ہے۔ میری امی اور سب بہن بھائی وہیں رہتے ہیں۔ پانچ بہن بھائی ہیں، سب شادی شدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر احسان ہے سب اپنے گھروں میں خوش باش ہیں۔" وہ شکر گزاری کے احساس سے بولی۔

"تو وہ سب مل کر تمہاری مدد کیوں نہیں کرتے؟ تاکہ تمہیں لوگوں کے گھروں میں کام نہ کرنا پڑے۔"

"اتنی مہنگائی کے زمانے میں اپنے گھر بار کا خرچ ہی مشکل سے پورا ہوتا ہے آپی! وہ سب سفید پوش لوگ ہیں۔ کوئی بھلا کب تک میری مدد کرے گا اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے کسی پر بوجھ بننا اچھا بھی نہیں لگتا۔ ہاں! لیکن اتنا ضرور ہے کہ سال میں ایک دفعہ جب میں چھوٹی عید پر اپنے میکے جاتی ہوں تو وہ سب مجھ سے بہت محبت اور خلوص سے ملتے ہیں۔ میری بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں، ہمارے آنے جانے کا کرایہ، میرے میاں اور بچوں کے کپڑے اور بہت سا کھانے پینے کا سامان میرے ساتھ کر دیتے ہیں۔ میری امی میرے لیے گھر کا خالص بنا ہوا دیسی گھی سنبھال کر رکھتی ہیں۔ میرے بچوں کے لیے میوے والے لڈو بنا کر دیتی ہیں۔ بھنے ہوئے چنے، مکئی، تل کے لڈو، میٹھی ٹکیاں اور سالن بنانے کے لیے دال کی بڑیاں بھی بنا کر دیتی ہیں۔ بس میں ان کی محبتوں میں لدی پھندی واپس آتی ہوں۔"

"کتنے دن کے لیے جاتی ہو؟" (میرا خیال تھا، وہ مہینے بھر کے لیے تو ضرور جاتی ہوگی۔)

"صرف دس دن ہوتے ہیں آپی! انہی میں سفر بھی اور قیام بھی۔"

"ارے بھئی! کراچی سے نوشہرہ تو کافی لمبا سفر ہو جاتا ہے اور صرف دس دن میں واپسی بھی؟" مجھے حقیقتاً دکھ ہوا۔

"ہاں آپی! تین چار دن تو آنے جانے کے سفر میں ہی لگ جاتے ہیں۔ مشکل سے چھ سات دن ہی اپنے میکے میں رہتی ہوں۔ امی مجھے دیکھ کر بہت روتی ہیں۔ انھیں بہت دکھ ہوتا ہے مجھے اس حال میں دیکھ کر۔۔۔ لیکن میں انھیں تسلی دیتی ہوں کہ اللہ جی کا احسان ہے، میں بہت خوش ہوں اپنے گھر میں۔"

"تو تمہارا شوہر کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کرلیتا، جس میں آمدنی زیادہ ہو؟"

"وہ غریب بے چارہ پڑھا لکھا بھی تو نہیں ہے نا! پانچ چھے جماعتیں پڑھی ہوئی ہیں بس۔ کوئی اچھی نوکری بھی نہیں مل سکتی۔ مزدوری کا کام بھی بہت کیا، اس میں اچھا گزارا ہو جاتا تھا، مگر اب وہ بھی نہیں مل رہا۔ مشکل سے یہ نوکری ملی ہے۔" وہ نظریں جھکا کر بولی۔

"اففف خدایا! تو تمہارے گھر والوں نے کیوں ایک ایسے شخص کو تمہارا رشتہ دے دیا تھا جو ٹھیک سے کماتا بھی نہیں؟ تم اچھی خاصی قبول صورت، اسمارٹ اور پڑی لکھی ہو، میٹرک تو کرر کھا ہے نا تم نے؟"

"جی آپی! بس میٹرک کرتے ہی گھر والوں نے میری شادی کر دی۔ دراصل میری خالہ نے میرا رشتہ مانگا اور امی اپنی بہن کی محبت میں انکار نہ کر سکیں اور بس۔۔۔ ہو گئی شادی!!"

"اوہو۔۔۔ یہ تو بہت برا ہوا شگفتہ!"

"نہیں آپی! برا تو نہیں ہوا۔ میرا شوہر بہت اچھا ہے، الحمدللہ! میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ بہت عزت کرتا ہے میری۔ کبھی اونچی آواز میں مجھ سے بات نہیں کرتا۔ کبھی کسی غلطی پر بھی مجھے نہیں ڈانٹتا۔ ہمیشہ نرم لہجے میں مجھ سے بات کرتا ہے۔ میں کچھ غلط کر بیٹھوں تو بہت پیار سے، نرمی سے مجھے سمجھاتا ہے۔ اس کی یہی خوبیاں تو ہیں جو میں آج تک اس کے ساتھ ہوں، ورنہ تو میں کب کا اسے چھوڑ کر چلی جاتی۔

"ہائیں ہیں۔۔۔ چلی جاتیں! چھوڑ کے چلی جاتیں۔۔۔؟؟" مجھے اس کی اتنی سمجھ داری والی باتوں کے بیچ میں یہ بات عجیب سی لگی۔

"جی آپی! میں نہ رہتی اس کے ساتھ۔۔۔ اگر وہ میری عزت نہ کرتا، میری چھوٹی موٹی غلطیوں کو نظر انداز نہ کرتا! یا وہ مجھ پر ہاتھ اٹھاتا، میری تذلیل کرتا، مجھے گالیاں دیتا۔۔۔ جیسے اس کا بڑا بھائی اپنی بیوی کو مارتا پیٹتا اور گالیاں دیتا تھا۔ میرا شوہر تو بہت اچھا ہے، آپی! میں نے تو اچھے بھلے پڑھے لکھے شوہروں کو دیکھا، بیویوں پر ہاتھ اٹھاتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، طعنے دیتے ہیں۔ شکر ہے ربُّ العالمین کا، میرے شوہر نے تو مجھ سے کبھی کڑوے لہجے میں بات بھی نہیں کی، ہاتھ اٹھانا تو دور کی بات ہے!! اسی لیے میں بھی اس کی بہت عزت کرتی ہوں، محبت کرتی ہوں، اس کے بغیر جینے کا تو تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ہر حال میں اس کا ساتھ دیتی ہوں، اس کی ہمت بڑھاتی ہوں، اس کا حوصلہ بن جاتی ہوں۔

اب آپ ہی بتائیں ایسے قدر کرنے والے شوہر کو غربت کی وجہ سے چھوڑ دینا زیادتی ہے کہ نہیں!!؟

"ہاں واقعی!!" میں نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں نے زندگی کے بہت اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں آپی! سسرال کی بہت سختیاں سہی ہیں۔ وہ کہنے کو تو میری خالہ کا گھر تھا، مگر میرے لیے تو بس وہ سب سسرالی رشتے بن گئے تھے۔ تین چار سال تک تو ہم ساتھ رہے، پھر میرا شوہر مجھے وہاں سے الگ گھر میں لے آیا۔ ساس کے گھر میں غربت بھی تھی اور جھگڑے بھی! اور ہر وقت کی تذلیل بھی اور یہ میرا اپنا گھر ہے، یہاں غربت تو ہے، مگر ذلت اور جھگڑے نہیں۔

آسانی تو کرائے کے گھر میں بھی نہیں ہوتی، آئے دن بدلنے پڑتے ہیں۔ پچھلے چودہ برسوں میں نہ جانے کتنے گھر بدل چکی ہوں میں۔ میرے جہیز کا سارا فرنیچر اور دیگر سامان بھی اسی چکر میں بک گیا۔ کبھی گھر میں جگہ نہ ہوتی رکھنے کے لیے تو کبھی مکان کا ایڈوانس یا کرایہ دینے کے لیے کچھ نہ کچھ بیچنا پڑ جاتا۔

بس اللہ تعالیٰ کا بہت بہت کرم ہے، آپی! ہم اپنی زندگی میں خوش ہیں مطمئن ہیں۔ مال و دولت تو سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ آج اِس کے پاس، کل اُس کے پاس۔ اصل چیز تو دل کا اطمینان اور سکون ہے۔ ہم سب اپنے اس چھوٹے سے گھر میں بہت خوش ہیں، الحمدللہ۔۔۔!! کبھی کبھی پریشانیاں بھی آتی ہیں، دکھ بیماریاں بھی گھیر لیتی ہیں، رشتے دار آجائیں تو خرچے کی فکر بھی ہوتی ہے، مگر اللہ سب کچھ کروا دیتا ہے آپی۔۔۔!!

شروع میں بہت پریشان ہو جایا کرتی تھی میں۔ آئے دن کسی نہ کسی چیز کے لیے ترسنا پڑتا تھا، پھر میں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اس کی خواہشیں اور ضرورتیں کتنی محدود ہیں، بس میں نے بھی اپنی خواہشوں اور ضرورتوں کو محدود کر لیا اور آپ کو بتاؤں آپی۔۔۔ ہماری اصل ضرورت تو روٹی کا ایک ٹکڑا ہے، جسے کھا کر زندہ رہ سکیں۔ سالن تو عیاشی ہے عیاشی۔۔۔ یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم ہنس پڑی۔ کبھی تو ہم تندور کی روٹی لیتے ہیں اور پانی سے کھا لیتے ہیں۔ بھوک میں سب کچھ اچھا لگتا ہے۔ وہ مزے سے بولی۔ (اور میں دل مسوس کر رہ گئی)

◆◆◆

"اچھا یہ بتاؤ، سسرال والوں سے ملنا جلنا ہے؟"

"ہاں جی! سب سے ملتے ہیں ہم، نہیں ملیں گے تو اللہ جی خفا ہوں گے۔ رشتے توڑنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا نا۔۔۔!! رشتے داریوں کو جوڑ کر رکھنے والے اللہ کے محبوب بندے ہوتے ہیں۔"

"واہ شگفتہ واہ!! تم تو بڑی سمجھ داری کی باتیں کرتی ہو، کہاں سے سیکھتی ہو؟"

"کبھی کبھی درس میں جاتی ہوں آپی! بڑا ہی اچھا لگتا ہے۔ اللہ، رسول ﷺ کی باتیں میرے دل کو بھاتی ہیں۔" سبحان اللہ! میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اچھا آپی! اب میں چلتی ہوں۔ میرا کام پہ جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ اٹھی اپنا برقع پہنا، بڑی اچھی طرح نقاب لگایا اور بہت آرام سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ میں نے آج غور سے دیکھا، اس کی چال میں بھی ایک وقار سا ہے۔ میں کھڑکی میں کھڑے ہو کر اسے دور تک جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ نظریں جھکائے راستے کے ایک طرف چلتی ہوئی وہ مجھے مُؤمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ (ایمان والیاں، ادب والیاں) کی عملی تفسیر لگی۔ سچ کہوں تو آج مجھے اس پر بے انتہا رشک آیا۔۔۔!!

آگے کا سفر

ایک خواب اور اس کی تعبیر

ندا اختر

یہ سڑک صاف اور طویل تھی، جس کے خاتمہ پر حد نظر تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا، جس کا ہر درخت چاند کی روشنی میں نہایا ہوا اور گوشہ گوشہ روشن تھا۔ یہ کیسی روشنی تھی؟ یہاں کیسا سکون تھا؟ وہ حیرت سے دیکھتے ہوئے چلی جا رہی تھیں، شوہر کے قدم سے قدم ملا کے آگے بڑھ رہی تھیں، انھیں یہ سڑک طے کر کے ایسے نخلستان میں جانا تھا۔ حیرت کی بات، ماہِ کامل کی روشنی سڑک پر نہیں صرف اسی شہرستان پر نثار ہو رہی تھی۔ وہ کتنی سرعت کے ساتھ اس طرف بڑھ رہی تھیں، انھیں خود علم نہ تھا۔ ہاں! احساس تھا تو صرف اتنا کہ اب درمیانی فاصلہ تمام ہونے والا تھا اور پھر چند قدم بعد ہی فاصلہ پورا ہو گیا، سڑک تمام ہو گئی۔ پلٹ کر دیکھا جدھر جدھر سے وہ گزر کر آئی تھیں، وہاں راستہ بالکل صاف اور سڑک دور تک چمک رہی تھی، پھر انھوں نے شوہر کی جانب دیکھا، اس سبزہ زار کی طرف قدم بڑھائے اور بولیں: ”آئیے!“

”نہیں، میرا سفر تمام ہو چکا، مجھے یہاں ٹھہر جانا ہے، آگے آپ جائیے۔“ شوہر کا جواب تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھ کھل گئی۔

صبح ابھی نہیں ہوئی تھی، مگر ہونے والی تھی۔ فلک پر چھٹتے ہوئے ستارے چشم خواب تھپک رہے تھے۔ کائنات ابدی نشہ میں مدہوش تھی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آواز گونج رہی تھی۔ یہ اسلام کے پہلے مؤذن خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اعلان کر کے مومنوں کو فریضہ نماز کی ادائیگی کے لیے پکار رہے تھے۔ اپنے اس عجیب و غریب خواب پر متحیر و مسرور خاتون اٹھیں، انھوں نے نمازِ صبح ادا کی اور پھر دیر تک خدائے واحد سے اس کی رحمت اور رضامندی طلب کرتی رہیں۔ وہ سوچوں میں گم تھیں، یہ کیسا خواب تھا، اسے وہ کیا سمجھیں کہ ان کے شوہر کا سفر تمام ہے اور انھیں ابھی آگے بڑھنا ہے اور آگے بھی کہاں۔۔۔ اس سبزہ زار کی طرف، جس کے لیے وہ کامل کی روشنی مخصوص ہے، جس کا گوشہ منور ہے۔ وہ خاموشی سے غور کرتی رہیں، سوچتی رہیں، مگر اس کی تعبیر نہ جان سکیں۔ یہ متحیر خاتون حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی، خنیس بن حذیفہ سہمی کی بیوی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں، پھر اس خواب کی تعبیر نے جب حقیقت کا رُخ کیا تو ہجرت کے دوسرے سال حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بیوہ ہو گئیں، اس وقت ان کی عمر صرف بیس سال تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سرورِ عالم ﷺ کے نکاح میں آ چکی تھیں۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے بیوہ ہونے کے بعد اسلام کے حکم کے مطابق جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں ان کے عقدِ ثانی کا خیال آیا، مگر وہ اس خواہش کو تقویت دینے کی ہمت نہ کر سکے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا ہر نکاح خدا کے حکم سے ہوا تھا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لیے تو واضح اشارات موجود تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے سمجھا کہ وہ اتنے اعلیٰ و ارفع نہیں ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے اس طرح تقرّب حاصل کر سکیں، لیکن حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا نکاح کرنا ان کا ذاتی مسئلہ نہیں تھا، جس میں خواہشات کو دخل ہوتا، یہ تو حکم خداوندی تھا، جس کے سبب مسلمان نکاح بیوگاں کو فرضِ منصبی سمجھتے تھے، لہٰذا جوں ہی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی عدّت کی معیاد ختم ہوئی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دستور کے مطابق عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بیٹی کے نکاح کا پیغام دیا۔ اس زمانے میں زوجہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو چکا تھا، لیکن ابھی انھوں نے دوسرا نکاح نہ کیا تھا اور تنہا تھے، یہی دیکھتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی کا پیغام انھیں دیا۔ یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے سماعِ مبارک تک پہنچا تو آپ ﷺ نے چند لمحے سکوت فرمایا، پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا اور گویا ہوئے: ”کیا میں عثمان (رضی اللہ عنہ) کو حفصہ (رضی اللہ عنہا) سے بہتر بیوی اور حفصہ (رضی اللہ عنہا) کو عثمان (رضی اللہ عنہ) سے بہتر شوہر نہ دے دوں؟“ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تعجب سے دیکھا، حضور ﷺ کا فرمان ایسا تھا، جسے ہر فرد بہ آسانی سمجھ سکتا تھا اور حقوقِ ہجرت و خدمتِ بدری کے نتیجے میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اس اعزاز کی مستحق تھیں۔ لہٰذا اسی زمانے میں حضور ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو امّ المومنین ہونے کا شرف بخشا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں اپنی دوسری صاحبزادی امّ کلثوم رضی اللہ عنہا کو دیا، جس کے بعد آپ ﷺ کے فرمان کی وضاحت ہو گئی۔

اس تقرّب پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ جتنا بھی فخر کرتے کم تھا۔ امّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نہایت خوش مزاج اور عبادت گزار تھیں۔ وہ بڑی گوشہ نشین اور پرہیز گار خاتون تھیں اور آپ کا یہ حال تھا کہ اشد ضرورت کے بغیر کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا۔ آپ رضی اللہ عنہا کا زیادہ وقت عبادت میں گزرتا، اگرچہ اس زمانہ میں آپ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں داخل ہوئیں۔ بالکل جوان تھیں، مگر آپ رضی اللہ عنہا میں بزرگوں جیسی سنجیدگی اور علما جیسا وقار تھا۔ آپ رضی اللہ عنہا کا زیادہ وقت تلاوتِ کلامِ پاک میں صرف ہوتا۔ آپ رضی اللہ عنہا اس کی باریکیوں کو سمجھتیں، ان پر غور فرماتیں، جو نکتہ سمجھ میں نہ آتا اس پر رسول اللہ ﷺ سے وضاحت طلب کرتی تھیں۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں قرآنِ پاک کا جو پہلا نسخہ جمع کیا۔ وہ امّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی امانت تھی۔ ۱۱ ہجری میں جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو جنابہ نے دنیا سے تمام تعلقات منقطع کر لیے اور گوشہ نشین ہو گئیں اور اس وقت سے اپنی وفات کے وقت تک آپ رضی اللہ عنہا صائم النّہار و قائم الّلیل رہیں۔ دیگر امہات کو نہ کبھی شکایت کا موقع دیا نہ کبھی خود کسی کی شکایت کی، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کچھ زیادہ ہی تقرّب حاصل رہا، جس طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ عمر بھر شیر و شکر رہے۔ اسی طرح ان کی صاحبزادیاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی ایک دوسرے کی غم خوار اور دوست رہیں۔

تیسری شے

لائبہ عبدالستار

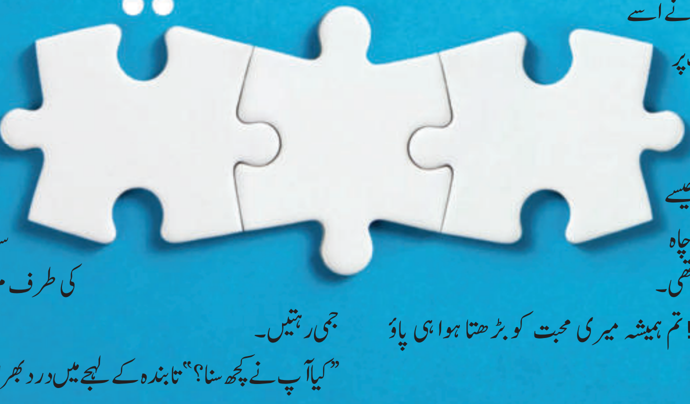

"ہمارا وقت کہاں گیا؟" تابندہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"یہ ہمارا وقت ہی تو ہے زوجہ محترمہ!" وہ حیرت سے بولا تو تھا، مگر حرکتِ انگشت موبائل پر متوجہ تھی۔

"کیسے؟" تابندہ نے استفسار کیا۔

"وہ ایسے کہ اس وقت میں صرف تمہارے ساتھ ہوں۔" المیر موبائل پر نگاہ مرکوز کیے بولا تھا۔

"نہیں ہیں آپ میرے ساتھ۔" تابندہ دُکھ بھرے لہجے میں بولی تھی، مگر شاید جس سے مخاطب تھی وہ اس دُکھ کو، لفظوں کی اداسی کو محسوس نہ کر سکا۔۔۔

"آخر کیوں؟؟؟" وہ روشناس شخص آج اس سے روگرداں کیوں تھا؟؟

تین ماہ پہلے کی گفتگو اس کے دماغ میں گشت کرنے لگی، جب وہ نئی نویلی دلہن بن کر اس کمرے میں لائی گئی تھی۔ المیر کی صورت میں خدا نے اسے بہترین دوست عطا کیا تھا۔ وہ اس کے مزاج و چاہت پر پورا اترنے والا شخص تھا۔

"مجھے لوگوں کے بدلنے سے، ان کے تبدیل ہوئے رویے سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ آپ جیسے ہیں ویسے ہی رہیں، تبدیل نہیں ہویے گا۔" بڑی چاہ سے اس نے اپنی دل کی بات المیر کے گوش گزاری تھی۔

"نہیں تبدیل ہوں گا، کبھی نہیں، یقین رکھو! تم ہمیشہ میری محبت کو بڑھتا ہوا ہی پاؤ گی۔" بڑے یقین سے اس نے یہ دعوی کیا تھا۔

"المیر! مجھے دعویٰ نہیں چاہیے، بس آپ اپنے عمل پر ثابت قدم رہیے گا۔"

"جی، جو حکم ہماری بیگم کا۔" وہ سرِ تسلیم خم کرتا ہوا بولا تھا۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ المیر ایک بہت اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ وہ ضرورت سے بڑھ کر اسے وقت دینے لگا تھا، اپنی طبیعت کے برخلاف اس نے اپنے مزاج کو تابندہ کے مزاج سے جوڑا تھا۔ دیکھنے والوں کا کہنا تھا، شادی سے پہلے اور بعد کی زندگی کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

مگر مزاج کہاں یکساں رہتے ہیں، رفتہ رفتہ بدل گئے۔ وہ بظاہر تو تابندہ کے ساتھ ہوتا، مگر توجہ تابندہ سے ہٹ کر موبائل کی طرف مرکوز رہتی۔ دورانِ گفتگو نگاہیں موبائل پر جمی رہتیں۔

"کیا آپ نے کچھ سنا؟" تابندہ کے لہجے میں درد بھرا تھا۔

بقیہ صفحہ نمبر 38 پر

بقیہ

نارنگی کے فائدے

نارنگی۔۔۔وٹامن سے بھرپور

نارنگی میں وٹامن بی اور سی بھی خاصی مقدار میں موجود ہیں، جو تازہ پھل اور جوس کی حالت میں تیس تا پینتیس فیصد تک جسمانی نظام میں شامل ہو جاتے ہیں، جبکہ وٹامن کی گولیوں کی صورت میں بہ مشکل پندرہ فیصد جذب ہوتے ہیں۔ بیج اور چھلکوں میں بقیہ وٹامن ضائع ہو جاتے ہیں۔

اورنج شفا بخش اور طاقت ور پھل

اورنج جوس ذیابطیس کے مریضوں اور کھلاڑیوں کے لیے بھی مفید ہے۔ اس کے علاوہ کم مقدار میں کیلشیم، میگنیشیم، فاسفورس، پوٹاشیم، سوڈیم اور سلفر بھی اس میں شامل ہیں اور نہایت خفیف مقدار میں تانبا، لوہا، زنک، برومائین اور میگنیز بھی موجود ہے۔ ان معدنیات کی فہرست سے آپ اورنج کی طاقت اور شفا بخشی کی قوّت کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

اورنج کا جوس

موسمی مالٹا، کینوں اورنج کا جوس بلاناغہ استعمال کرنے سے آپ اپنی کھوئی ہوئی توانائی اور طاقت دوبارہ بحال کر سکتے ہیں۔ اورنج کے خواص میں بے سکونی اور ڈپریشن سے نجات روح اور جسم کی صفائی و تازگی اور سکون و طاقت سب سے نمایاں ہیں۔ اورنج استعمال کرنے والوں کے چہرے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بالخصوص خواتین اس کا استعمال کثرت سے کیا کریں۔

اورنج اور بچوں کا مستقبل

امراضِ قلب کے لیے اورنج کارآمد اور مفید ہے۔ مثلاً تشنجِ قلب، دل کی غیر معمولی دھڑکن، بلڈ کولیسٹرول وغیرہ پر نہایت مفید اثرات مرتب کرتا ہے۔ دورانِ خون کو اعتدال پر لاتا ہے۔ فسادِ خون کے تمام امراض میں بھی فائدہ کرتا ہے۔ قلب کے حوالے سے جذباتی پریشانیوں، اسٹریس، تناؤ و درنجی زود حسی، بات بے بات پر رو دینا، ذہنی پریشانی، مالی پریشانی، بچوں کے مستقبل کے بارے میں ذہنی دباؤ وغیرہ کے لیے اورنج اکسیر کا کام کرتا ہے۔

نارنگی کے فوائد

نارنگی نظامِ مدافعت کو تقویت دے کر خون صاف کرتا ہے۔

نارنگی نروس سسٹم اور اعصابی کھچاؤ کے لیے نہایت سکون آور ہے۔

نارنگی رگوں، شریانوں اور خون کی نالیوں کو لچک دار اور طاقت ور بناتا ہے۔

نظامِ انہضام میں اورنج ایک فائدہ مند پھل

نظامِ انہضام کے لیے اورنج بہت فائدہ مند پھل ہے۔ ◆ زود ہضم ہے۔ ◆ قبض دور کرتا ہے۔ ◆ آنتوں کی حرکت کو مؤثر بناتا ہے۔ ◆ معدے کے افعال کو درست کرتا ہے۔ ◆ ریاح کو خارج کرتا ہے۔ ◆ معدے کی اصلاح اور امراض دور کرنے کے لیے اورنج، مالٹا، کینوں اور موسمی کا جوس ہر کھانے کے بعد ایک گلاس پییں، صبح نہار منہ پئیں کم اور سادہ غذا استعمال کریں اور بغیر چھنے آٹے کی روٹی کھائیں۔

رشتے ہیں انمول

سعدیہ اجمل

بیگم ذرا رملہ کو تو دیکھتی آؤ، کہیں ابھی تک سو نہ رہی ہو۔ مختار صاحب جو اخبار پڑھ رہے تھے، اچانک خیال آنے پر چشمے کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے گویا ہوئے۔

''جی دیکھتی ہوں آپ کی لاڈلی کو، پتا نہیں کب ذمے داری کا احساس ہوگا شہزادی کو! آپ نے خوامخواہ میں ہی اتنا سر چڑھا رکھا ہے اسے، کل کلاں اگلے گھر بھی تو جانا ہے، سسرالی نہیں برداشت کرتے یہ چونچلے۔'' ریحانہ بیگم نے کچن سے نکلتے ہوئے کہا۔ وہ رملہ کے کمرے کی طرف جا ہی رہی تھیں کہ ببلی جو گھر کی ملازمہ تھی، اس کو ٹھوکر لگی اور ہاتھ میں پکڑی ٹرے زمین بوس ہوگئی اور ٹرے میں موجود کپ، پرچ اور چائے بھری کیتلی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔

ریحانہ بیگم نے ملازمہ کو تیز نظروں سے گھورا، وہ بے چاری سہم گئی، ریحانہ بیگم مزاج کی خاصی تیز تھیں، آج کیسے انھوں نے ضبط کیا اور ملازمہ کو صرف گھورنے پر اکتفا کیا اس پر ملازمہ کے ساتھ ساتھ مختار صاحب بھی حیران تھے

سفید چوڑی دار پاجامے کے ساتھ بے بی پنک لمبی ٹخنوں تک فراک زیب تن کیے اور سر پر خوب صورت انداز میں اسٹالر سیٹ کیے ہوئے رملہ اپنے کمرے سے نکل کر تیز تیز قدموں سے ڈائننگ روم کی طرف جانے لگی۔

''گڈ مارننگ ڈیڈ!'' باپ کے گلے میں بازو ڈال کر رملہ نے لاڈ سے کہا۔

''گڈ مارننگ گڑیا!'' مختار صاحب نے رملہ کو شفقت سے پچکارتے ہوئے کہا۔

رملہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ وہ ریحانہ بیگم کو ایسے نظر انداز کیے ہوئے تھی گویا کہ وہ وہاں موجود ہی نہ ہوں۔

''اسٹڈی کیسی جا رہی ہے میری گڑیا کی؟'' منہ میں انڈے کا ٹکڑا ڈالتے ہوئے مختار صاحب نے سرسری سا رملہ سے پوچھا۔

''آپ کی گڑیا ہمیشہ کی طرح اب بھی ٹاپ آف دا کلاس ہے ڈیڈ۔'' رملہ نے شوخی سے کہا۔

''ویل ڈن مائی چائلڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' مختار صاحب نے فخریہ انداز میں کہا۔

''سسرال جا کر یہ پڑھائی تھوڑی کام آئے گی، تھوڑی گھر گرہستی بھی سیکھو بیٹے! اب کیا پتا قسمت کا کہ آپ کو میری طرح یہ عیش و آرام اور نوکروں کی فوج ملے نہ ملے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی ریحانہ بیگم نے رملہ سے کہہ ہی دیا۔

''ایکسکیوز می! کیا کہا آپ نے، دوبارہ کہیں ذرا۔ شاید آپ بھول رہی ہیں کہ میں اس جائیداد کی اکلوتی وارث ہوں، کیوں کہ آپ کے ہاں تو اولاد۔ دد د!'' رملہ نے بھی دوبدو جواب دیا۔

رملہ کی عمر پانچ سال تھی، جب اس کی ماں دارِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ مختار صاحب اس غم کو سینے سے لگا بیٹھے اور بیٹی سے بلکل لاتعلق ہوگئے۔ تبھی سب نے کہہ کہلوا کر ان کی دوسری شادی ریحانہ سے کروادی، تاکہ ان کی زندگی کا سکوت ٹوٹے اور پھر کیا پتا اللہ اولاد نرینہ سے نواز دے۔ لیکن ریحانہ بیگم کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جانے والوں کو کون روک سکتا ہے، آخر کار مختار صاحب نے بھی سمجھوتا کرلیا اور ساتھ ہی وہ رملہ کو بھرپور توجہ دینے لگے۔ ریحانہ بیگم سے رملہ کو ماں والا پیار نہیں ملا اور رملہ ماں کے لمس سے ہمیشہ محروم رہی اور نتیجہ یہ نکلا کہ اس رشتے سے احساسِ کمتری کی وجہ سے وہ سرکش ہوتی گئی۔ اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ ریحانہ بیگم کی ایک بات کے دس دس جواب تیار رہتے اور زیادہ تر رملہ اولاد نہ ہونے کے زخم پر وار کرتی، جس پر ریحانہ بیگم کا مزاج ہمہ وقت برہم رہتا اور اس غصے کا عتاب گھر کے ملازمین کو جھیلنا پڑتا۔

ناشتا کرتے ہی رملہ یونیورسٹی جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''گڈ بائے ڈیڈ!'' رملہ نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''گڈ بائے مائی چائلڈ، ٹیک کیئر!'' مختار صاحب مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔ وہ دل ہی دل میں اپنی بیٹی کے ہمیشہ خوش و خرم رہنے اور گھر کے پُرسکون ماحول کے لیے کی دعا گو تھے۔

رملہ نفیس سا بیگ کندھے پر ٹکائے خراماں خراماں چلتے ہوئے باہر گئی، نئے ماڈل کی نئی نویلی سٹی (city) کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کے ہر ہر انداز سے امارت جھلکتی تھی۔ امیر، بے حد خوب صورت اور پھر ذہین بھی۔ یونی میں بھی جو اسے دیکھتا متاثر ہوئے بنا نہ رہتا، لیکن وہ کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتی، اس کے نزدیک سب کیڑے مکوڑوں سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ اگر رملہ کو کوئی عزیز تھا تو وہ صرف اس کے ڈیڈ تھے جنھیں وہ اپنا ہیرو مانتی تھی۔

میوزک فل آواز میں بج رہا تھا اور رملہ میوزک میں مگن گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی اور اسے سامنے سے آنے والی بس کا بھی پتا نہیں چلا۔ بس ڈرائیور مسلسل ہارن دے رہا تھا، جیسے ہی رملہ کی نظر سامنے پڑی تو بریک لگاتے لگاتے گاڑی بے قابو ہوگئی اور سڑک کنارے درخت سے جا ٹکرائی اور اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

''جی جی میں رملہ کا والد بات کر رہا ہوں، یہ تو رملہ کا نمبر ہے، کیا ہوا سب ٹھیک ہے نا؟'' مختار صاحب کے لہجے میں بے چینی تھی۔

''گاڑی درخت سے ٹکرانے کی وجہ سے آپ کی بیٹی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے، اس کے موبائل میں آپ کا نمبر ڈیڈ کے نام سے سیو تھا تو ہم نے آپ کو اطلاع دینا مناسب سمجھا۔ ہم نے انھیں فوری طور پر ٹراما سینٹر تو پہنچا دیا ہے اب آگے اللہ مالک ہے۔ آپ کو پتا بھیج رہے ہیں آکر دیکھ لیں۔'' الفاظ تھے کہ ایٹم بم! مختار صاحب ڈھے گئے۔ انھوں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور تقریباً بھاگتے ہوئے آفس سے نکلے اور گاڑی مطلوبہ لوکیشن پر ڈال دی۔

''یا اللہ! اپنا کرم کر، اب مجھ میں کچھ بھی کھونے کی ہمت نہیں ہے۔'' انھوں نے بھیگی آواز میں فریاد

سوشل زہر

مہابہ غازی

زینب چودہ سال کی ایک نوجوان لڑکی تھی، جس کے دل میں خواب اور تجسّس کی روشنی تھی۔

صبح کی ہلکی سنہری کرنیں کمرے کی کھڑکی سے آرہی تھیں اور نرم ہوا کے جھونکے اس کے بالوں کو سہلا رہے تھے۔ ہر دن اس کے لیے نیا ہوتا، چھوٹی چھوٹی چیزیں اسے حیران کر دیتیں۔۔۔ پتوں کی سرسراہٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ، محلے کے بچوں کی ہنسی اور اپنے دل کے اندر اٹھتے خیالات۔

گھر میں موبائل کی سخت پابندی تھی۔ والدین نے کہا تھا: "بیٹی! موبائل ضرورت کے لیے، شوق یا دکھاوے کے لیے نہیں۔" لیکن زینب کا دل چھوٹے چھوٹے خواب دیکھتا تھا۔ وہ بھی دیکھنا چاہتی تھی، تجربہ کرنا چاہتی تھی، وہ سب جو اس عمر کی لڑکیاں کر رہی تھیں۔

شام کا وقت تھا۔ دھوپ اپنی آخری کرنیں بکھیر رہی تھی اور محلے کی گلی میں کچھ لڑکیاں موبائل پکڑ کر رقص کر رہی تھیں۔ زینب دور سے دیکھ رہی تھی۔ ہر ہنسی، ہر تال، ہر حرکت اس کے دل کو چھو رہی تھی۔ دل میں ایک نرم خواہش جاگ اٹھی: "کاش! میں بھی ایسا کر سکوں۔"

وہ چھوٹے قدموں سے پیچھے ہٹی، لیکن دل تیز دھڑک رہا تھا۔

ذہن میں سوالات اٹھنے لگے: "کیا واقعی میں یہ خوشی ہے یا صرف دکھاوا۔۔؟ کیا یہ سب حقیقی زندگی کا حصہ ہے یا صرف نظر آنے کے لیے ہے۔۔۔؟"

چند دن بعد۔۔۔ زینب نے والد کے موبائل سے پہلی بار ٹک ٹاک کھولا۔ وہ اپنے کمرے کے کونے میں بیٹھی، دل میں ہلکی سی دھڑکن اور انگلیوں میں لرزش کے ساتھ۔ ویڈیوز کے رنگین فلٹرز، ہر قہقہہ، ہر رقص اس کے دل میں اتر گئے۔ وہ خود بھی آئینے کے سامنے چھوٹے چھوٹے قدم، ہاتھوں کی حرکتیں دہراتی، کبھی ہونٹوں سے گنگناتی۔ دل میں عجیب سی جلن اور اُدھوری بے چینی جاگ رہی تھی۔ وہ جو ہمیشہ حیا کی چادر میں لپٹی رہتی تھی، اب نرم نرم کھل رہی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ زینب کے دن اور راتیں اس کشمکش میں گزرتی۔۔۔ ہر ویڈیو کے بعد دل میں سوال، ہر حرکت کے بعد دل میں ہچکیاں: "کیا میں واقعی خوش ہوں یا صرف دکھاوا کر رہی ہوں؟ کیا یہ سب میری حقیقی زندگی کا حصہ ہے یا صرف رنگین تصویر؟"

ایک دن شام کے وقت، زینب چھت پر بیٹھی تھی۔ ہوا کے نرم جھونکے اس کے بالوں کو سہلا رہے تھے اور آسمان پر ہلکی سنہری روشنی بکھری تھی۔ دل میں ایک آواز سنائی دی: "زینب! یہ سب دکھاوا ہے۔ اصل خوشی تمہارے دل، حیا اور ایمان میں ہے۔"

زینب نے پہلی بار موبائل نیچے رکھا۔ پہلی بار دل میں سکون محسوس ہوا۔ رنگین دنیا، قہقہے، تالیاں، سب کچھ دھندلا لگنے لگا۔ اگلے دن سے، وہ کتابیں پڑھنے لگی۔ دوستوں کے ساتھ کھیلنے لگی۔ ہر لمحہ زندگی کو جیتی جاگتی محسوس کرنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے لمحات، جیسے ہوا کا لمس، زمین کی خوشبو، ہر چھوٹی چیز اب اس کے لیے حقیقی خوشی بن گئی۔ ہر قدم، ہر ہنسی، ہر سوچ اب حیا اور ایمان کے رنگ میں رنگ گئی۔

زینب کے دن اب مختلف تھے۔ صبح نماز کے بعد قرآن کھولتی اور ہر لفظ میں سکون محسوس کرتی۔ دن کے دوران وہ دوستوں کے ساتھ کھیلتی، کتابیں پڑھتی، کبھی کبھار محلے کے بچوں کو چھوٹی چھوٹی کہانیاں سناتی۔ ہر لمحہ اس کے لیے حقیقت بن گیا۔

وہ اب موبائل صرف ضرورت کے لیے استعمال کرتی۔ ہر نیا ٹرینڈ دیکھ کر متاثر نہیں ہوتی، بلکہ اپنے دل کی آواز سنتی۔ اس نے جان لیا کہ حقیقی خوشی اور طاقت دل اور ایمان میں چھپی ہوتی ہے۔ ہر چھوٹا فیصلہ، ہر لمحہ، ہر ہنسی اور ہر قدم اس کے لیے سبق تھا۔

زینب نے سیکھ لیا کہ حقیقی خوشی اور طاقت صرف دل، حیا اور ایمان میں چھپی ہوتی ہے اور وہ ہنستی رہی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں، ہر لمحہ سبق سیکھتے ہوئے، ایک نوجوان لڑکی کی حیادار، باشعور اور روشنی بھری زندگی کے ساتھ۔

کی۔ جب وہ ٹراما سینٹر پہنچے تب تک رملہ کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا جا چکا تھا۔ رملہ کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی اور فوری طور پر آپریشن ضروری تھا۔ لاڈلی بیٹی کی یہ حالت مختار صاحب سے دیکھی نہ گئی اور وہ زمین پر بیٹھتے چلے گئے۔ ان کی آنکھوں سے ایک سمندر رواں تھا۔ اچانک کچھ خیال آنے پر انھوں نے موبائل نکالا اور ایک نمبر ملانے لگے۔

"ہیلو ریحانہ! ہماری رملہ۔۔۔" اس کے بعد جو سنا ریحانہ بیگم کانپ اٹھیں اور فوراً ٹراما سینٹر روانہ ہوئیں۔ جب وہاں پہنچیں تو مختار صاحب کی لٹی پٹی حالت دیکھ کر ان کے پسینے چھوٹ گئے۔

"مخ۔۔ مختار۔۔ آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ رملہ کہاں ہے؟ کیسے ہو گیا یہ سب؟ وہ تو صبح گھر سے بالکل ٹھیک نکلی تھی نا؟" ریحانہ بیگم بدحواسی کے عالم میں سوال پہ سوال کیے جا رہی تھیں۔

مختار صاحب نے بے بسی کے عالم میں آپریشن تھیٹر کی طرف اشارہ کیا اور بولے: "ریحانہ! میری بیٹی جس کو میں نے پھولوں کی طرح پالا پوسا آج زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے"

"افف خدایا!" وہ صدمے سے بیٹھتی چلی گئیں۔ ان کی آنکھوں سے متواتر آنسو بہہ رہے تھے۔

"مبارک ہو مختار صاحب! اللہ تعالیٰ نے آپ کی بیٹی کو نئی زندگی دی ہے۔ آپریشن بہت خطرناک تھا اور بچنے کے چانسز بہت کم! لیکن اللہ نے اپنا بہت کرم کیا۔" ڈاکٹر نے تسلی آمیز انداز میں مختار صاحب سے کہا۔

"یااللہ تیرا شکر!" مختار صاحب عاجزی سے گویا ہوئے۔ "شکریہ ڈاکٹر!" اس کے بعد ڈاکٹر سے کہا۔

"نو نیڈ، اٹس مائی ڈیوٹی!" ڈاکٹر پیشہ ورانہ انداز میں کہہ کر مختار صاحب کا کندھا تھپتھپاتا آگے بڑھ گیا۔ جبکہ کچھ دور جائے نماز پر بیٹھی دعا مانگتی ریحانہ بیگم سجدۂ شکر بجا لائیں۔

رملہ کو روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ ریحانہ بیگم اس کا پورا پورا خیال رکھتی۔ ملازموں کی موجودگی میں بھی وہ رملہ کے لیے خود کھانا بناتی تھیں۔ آخر کار رملہ ہی کی صورت میں ان کی مامتا کو قرار آیا تھا۔ یونیورسٹی کے سارے ہم جماعت رملہ کی عیادت کو آئے تھے اور پہلی دفعہ وہ سب سے والہانہ انداز سے ملی تھی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ رشتوں کو دولت کے ترازو میں نہیں تولتے۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی احساس ہو گیا کہ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا، جن غریب لوگوں کو وہ کیڑے مکوڑے کہتی تھی انہی کی وجہ سے اس کی جان بچ پائی تھی۔ دراصل جہاں اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، وہاں پر موجود ٹھیلے والوں نے ہی اسے بروقت ٹراما سینٹر پہنچایا تھا۔ اسے اب کچھ نہیں چاہیے تھا کیوں کہ اسے ایک پیار کرنے والی ماں اور ڈھیروں دوست مل گئے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔

بیت السلام موبائل ایپ

Available on the App Store

GET IT ON Google Play

- قبلہ ڈائرکشن
- ان فلائٹ نماز ٹائمنگ
- آن لائن ڈونیشن
- زکوۃ کیلکولیٹر
- لائیو اور ریکارڈ بیانات
- روزمرہ کی دعائیں
- قرآن کریم
- نماز ٹائمنگ

قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ

حجاب سید

هزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہر قوم کی تاریخ میں کچھ ایسے لمحے آتے ہیں جو صدیوں تک اس کی تقدیر بدل دیتے ہیں اور ان لمحوں کو عظمت عطا کرنے والی شخصیات وقت کے دھارے پر نقوش چھوڑ جاتی ہیں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے وہ لمحہ 14 اگست 1947 تھا اور وہ شخصیت تھیں: بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ۔

یہ چمن ہے ہمارا، ہمارا یہ گلزار ہے،
یہ وطن ہے ہمارا، ہم اس کے نگہدار ہیں

یومِ قائدؒ — تاریخ سے تجدیدِ عہد تک

ہر سال 25 دسمبر ہمیں ایک عظیم رہنما کی یاد دلاتا ہے، وہ مردِ مومن، جس کے عزم و استقلال نے غلامی کے اندھیروں میں روشنی کی شمع جلائی۔ یہ دن صرف قائداعظم محمد علی جناح کا یومِ پیدائش ہی نہیں بلکہ پاکستان کے نظریے کی تجدید کا دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب ہمیں رک کر سوچنا چاہیے کہ کیا ہم نے اس ملک کو وہ منزل دی جس کا خواب قائداعظمؒ نے دیکھا تھا؟ کیا ہمارا پاکستان واقعی وہی ریاست ہے جو اسلامی عدل و مساوات، تعلیم واخلاق اور ایمان و عمل کی بنیاد پر کھڑی ہو؟

قائدؒ کا پیغام — آج بھی زندہ ہے

قائدِاعظمؒ کا یہ قول ہمارے لیے مشعل راہ ہے: ”پاکستان اس لیے حاصل کیا گیا ہے کہ یہاں اسلام کے اصولوں پر مبنی ایک آزاد ریاست قائم ہو۔" بد قسمتی سے ہم وقت کے ساتھ اس مقصد سے کچھ دور ہو گئے ہیں۔ مگر اگر ہم ایمان، دیانت، علم اور عمل کی راہوں پر لوٹ آئیں تو پاکستان پھر سے قائد کا خواب بن سکتا ہے۔

قائد کا نظریہ — تین سنہری اصول

قائداعظمؒ نے قوم کو تین سنہرے اصولوں کا پیغام دیا:

ایمان، اتحاد، تنظیم۔ یہ تین الفاظ محض نعرہ نہیں، بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہیں۔ ان کے نزدیک ایمان، صرف عقیدہ نہیں بلکہ کردار کی سچائی ہے، اتحاد، صرف ظاہری اجتماع نہیں بلکہ دلوں کا جوڑ ہے، اور تنظیم، صرف نظم و ضبط نہیں بلکہ قوم کی اجتماعی قوت کا مظہر ہے۔ اسی لیے تو علامہ اقبال کہتے ہیں:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

قائداعظمؒ کا خواب ایک ایسے پاکستان کا تھا جہاں قرآن کی تعلیمات عملی زندگی کی بنیاد بنیں، جہاں عدل، انصاف، علم اور اخلاق قوم کی شناخت ہوں۔

قائد کا پیغام نوجوانوں کے نام:

قائداعظمؒ ہمیشہ نوجوانوں سے کہا کرتے تھے:

”پاکستان کی اصل طاقت تم ہو۔ تمہارے علم، تمہارے عمل اور تمہاری دیانت سے ہی قوم کی تقدیر بدلے گی۔“

آج کے نوجوان کے لیے یہ دن محض ماضی کی یاد نہیں بلکہ ایک عملی تحریک ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم قائد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے علم کو عمل میں بدلیں، اور اپنی محنت و ایمان سے پاکستان کو اس کے اصل نظریے سے ہم آہنگ کریں۔

چل، میرے وطن! کہ تجھ پہ ہے دنیا کا انحصار
تیرے شباب سے ہے محبت کو اعتبار

کردار اور دیانت — کامیابی کا زینہ

قائداعظمؒ کی قیادت کی سب سے بڑی بنیاد ان کا کردار اور دیانت تھی۔ وہ نہ جھوٹ بولتے تھے، نہ کسی دباؤ میں آتے تھے۔ ان کی سچائی کا یہ عالم تھا کہ ان کے مخالفین بھی انہیں ایک دیانت دار سیاست دان کہتے تھے۔ انہوں نے امت کو یہ سبق دیا کہ سیاست ہو یا معیشت، تعلیم ہو یا عبادت — سب میں اخلاق کا غلبہ ہونا چاہیے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی،
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

تجدیدِ عہد اور ہمارا فرض

آج جب ہم 25 دسمبر مناتے ہیں تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ دن صرف جشن نہیں بلکہ ذمہ داری کی یاد دہانی ہے۔ ہمیں عہد کرنا چاہیے کہ ہم پاکستان کو قائداعظمؒ کے خواب کے مطابق ایمان، علم، عدل، اور اتحاد کی روشنی میں سنواریں گے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے اور یہ عہد کرنا چاہیے! ہم اپنے قائدِ ملت کی راہ کے راہی ہیں ان کا پیغام ہمارا ایمان و عمل ہے۔

ایک نئی صبح کی دعا

پچیس دسمبر ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ملتوں کی زندگی صرف الفاظ سے نہیں، کردار سے بنتی ہے۔ آئیے، اس دن ہم سب عزم کریں کہ ہم اپنے قائد کے نظریے کو زندہ رکھیں گے۔ ایسا پاکستان جو عدل وانصاف، علم و محبت اور اسلامی اقدار سے جگمگاتا ہو۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

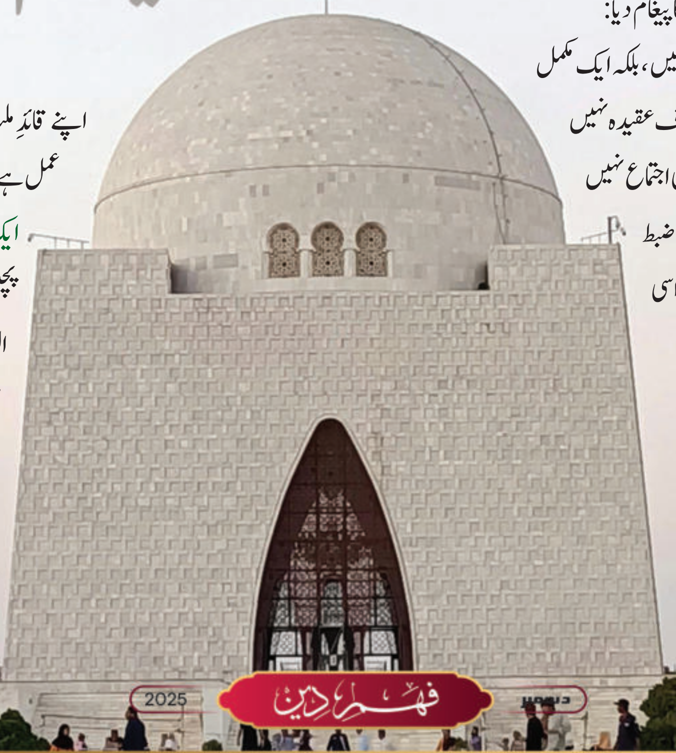

چال

مہوش اسد شیخ

"بچو! اُٹھ جاؤ نماز کا وقت ہو چکا ہے۔" دادی جان نے جائے نماز بچھاتے ہوئے قریب سوئے بچوں کو پکارا۔

احمد کسمسا کر کروٹ بدل گیا۔ ارحم نے آنکھیں تو کھول دیں، لیکن کسلمندی سے بستر میں ہی پڑا رہا۔ سات سالہ مونا دادی جان کی آواز پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر آنکھیں مسلتی رہی، پھر بستر سے اتری اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ دادی جان نماز شروع کر چکی تھیں۔

"احمد، ارحم بیٹا! نماز کا وقت نکل جائے گا، نماز وہی جو وقت پر پڑھی جائے۔" سلام پھیر کر دادی جان نے ایک بار پھر آواز لگائی۔

"بس تھوڑا سا مزید سونے دیجیے، پھر اٹھ جائیں گے۔" ارحم نے التجا کی۔ احمد ہنوز بے اثر سویا پڑا تھا۔

نماز مکمل کر کے دادی جان نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ اس دوران مونا بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو کر نماز پڑھنے لگی۔ دادی جان نے دعا سے فراغت کے بعد گھڑی پر نگاہ ڈالی، وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ وہ جائے نماز وہیں چھوڑ کو بچوں کی طرف چلی آئیں، ان کے بالوں میں نرمی سے انگلیاں چلانے لگیں۔

"چلو میرے بچو، اٹھ جاؤ! دیکھو وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔" انھیں روزانہ بچوں پر اتنی محنت کرنی پڑتی تھی۔ سات سالہ مونا زیادہ تنگ نہیں کرتی تھی، لیکن نو سالہ احمد اور گیارہ سالہ ارحم کو اپنی نیند بہت پیاری تھی۔ بہت جتن کر کے انھیں نماز کے لیے تیار کیا اور خود قرآن پاک کھول کر بیٹھ گئیں۔

مونا نماز مکمل کر کے یٰسین کھول کر بیٹھ گئی۔ دونوں بھائی نماز پڑھ رہے تھے۔ دادی جان گاہے بگاہے نگاہ اٹھا کر انھیں دیکھ لیتی تھیں۔

"ارحم کہاں گیا؟" کچھ دیر بعد دادی جان نے نگاہ اٹھائی تو ارحم کو غائب پایا۔ گردن گھما کر دیکھا تو وہ صوفے پر آنکھیں موندھے لیٹا تھا۔

"یہ ارحم پھر سو گیا، اس نے یٰسین نہیں پڑھی اور صبح کے اذکار بھی رہ گئے۔" دادی جان بڑبڑانے لگیں۔

"بھیّا نے تو کل بھی نہیں پڑھی تھی۔" مونا نے سر اٹھا کر ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

دادی جان کچھ دنوں سے دیکھ رہی تھیں ارحم کی نماز میں بھی دلچسپی کم ہو رہی تھی اور اذکار وغیرہ سے تو بالکل لاپروائی برت رہا تھا۔

ندیم صاحب بچوں کے والد صاحب محکمۂ تعلیم میں ایک بڑی پوسٹ پر تھے اور والدہ ایک نجی اسکول میں پرنسپل کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں۔

والدین کی بدولت بچے دنیاوی تعلیم اچھے اداروں سے حاصل کر رہے تھے اور دینی تعلیم و تربیت دادی جان نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ عصر کے بعد وہ دادی جان سے قرآن بھی پڑھتے اور احادیث کا سبق بھی لیتے تھے۔ دادی جان انھیں ایمان افروز قصے بھی سنایا کرتی تھیں۔ انبیائے کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کتنے ہی قصے بچوں کو ازبر تھے۔

جیسے جیسے بچے بڑے ہو رہے تھے دادی جان کو زیادہ خیال رکھنا پڑتا تھا۔ ان کی ذہن سازی اتنی آسان نہ رہی تھی۔ ہر معاملے میں طرح طرح کے سوالات کرنے لگے تھے۔ اب جانے بچے کے ذہن میں کیا چل رہا تھا کہ اس نے قرآن پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔

دادی جان سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ بچے سے پوچھ گچھ کرنے کی بجائے آج یٰسین کے فضائل پر بات چیت کی جائے۔ دل خود بخود اس طرف مائل ہونے لگے گا۔ اگر بچے کے دل میں کوئی بات ہے تو کھل کر سامنے آ جائے گی اور اسے سمجھانا آسان ہو جائے گا۔

عصر کی نماز پڑھنے کے لیے دونوں بھائی اپنے والد صاحب کے ساتھ مسجد جاتے تھے۔ وہ واپس آئے تو مونا اور دادی جان بھی نماز پڑھ چکے تھے۔ ندیم صاحب اپنے کمرے کی طرف چلے گئے اور دونوں لڑکے دادی جان کی طرف آ گئے۔ تینوں دادی جان کے ارد گرد بیٹھ گئے۔

"اچھا تو آج ہم بات کریں گے سورۂ یٰسین کے فضائل پر۔۔۔"

"لیکن اس پر تو ہم پہلے بھی بات کر چکے ہیں۔" مونا نے معصومیت سے دادی جان کی بات کاٹ ڈالی۔

"بار بار دہرانے سے باتیں یاد رہتی ہیں، کوئی بات ذہن سے نکلتی نہیں۔" احمد نے بہن کے سر پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے، بہت خوب صورت بات کہی۔

دادی جان، بہت محبت سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"بالکل احمد بیٹا! ایسا ہی ہے۔ بار بار دہرانے سے باتیں یاد رہتی ہیں اور اگر کسی کو کچھ بھول رہا ہو تو اسے بھی یاد آ جاتا ہے۔" انھوں نے کن انکھیوں سے ارحم کی طرف دیکھا جو سر جھکائے بیٹھا تھا، جانے ان کی باتیں سن بھی رہا تھا کہ نہیں۔

"پہلے مونا کی باری ہے، یٰسین کی ایک فضیلت بیان کرے!" دادی جان نے اسے بولنے کا اشارہ کیا۔

ترجمہ: "جس شخص کا ہر رات سورۂ یٰسین پڑھنے کا معمول ہو، پھر وہ شخص اپنے بستر پر مرے تو اللہ تعالیٰ اس کو شہدا میں شامل فرمائیں گے۔" مونا نے ایک سانس میں ہی حدیث مکمل سنا ڈالی۔

دادی جان اسے شاباش دینے کے بعد احمد کی طرف دیکھنے لگیں۔

ترجمہ: "جو شخص رات کے وقت سورۂ یٰسین پڑھ لیتا ہے، وہ اس حال میں صبح کرتا ہے کہ اس کے پچھلے تمام (صغیرہ) گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔"

"ماشااللہ بہت خوب!" دادی کی شاباش پر احمد پُرجوش انداز میں مزید بولنے لگا۔

ترجمہ: حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: "جو شخص دن کے اوّل حصّے میں سورۂ یٰسین پڑھ لیتا ہے، اس کی پورے دن کی ضروریات پوری کر دی جاتی ہیں۔"

"نہیں! میں اس پر اتفاق نہیں کرتا۔" سب نے حیرت سے ارحم کی

خاموش محافظ

آمیلیہ فلک

یہ کوئی عام گاؤں نہیں تھا۔ یہ وہ زمین تھی جس کی مٹی میں صدیوں کی داستانیں دبی تھیں، مگر اب اس کی فضا میں خوف اور خاموشی کا راج تھا۔ شمالی وزیرستان کے ایک کنارے پر واقع اس گاؤں میں زندگی جیسے سہم کر سانس لے رہی تھی۔ اسکول بند، بازار ویران اور مسجد کے منارے سے صرف اذان کی گونج، باقی سب خاموش! نہ ہنسی، نہ امید صرف ڈر۔

پھر وہ دن آیا جب دھول اڑاتی ہوئی فوجی گاڑیاں گاؤں کی حدود میں داخل ہوئیں۔ لوگ کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر دیکھتے رہے۔ کچھ دلوں میں شکر کا جذبہ جاگا، کچھ میں شکوک و شبہات، مگر سب کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا: کیا یہ تبدیلی کا آغاز ہے یا کوئی نیا دھوکا؟

کمانڈر علی شاہ، ایک نرم گفتار مگر فولادی ارادوں والا آفیسر، اس آپریشن کا نگران تھا۔ اس کا تعلق خود ایک چھوٹے سے گاؤں سے تھا، لہٰذا وہ ان لوگوں کا درد جانتا تھا۔ ”ہم صرف بندوق نہیں لائے، دل بھی لائے ہیں۔“ اُس نے اپنے جوانوں سے کہا۔

چند دنوں میں حالات بدلنے لگے۔ اسکول کی عمارت کی مرمت شروع ہوئی، ویران بازاروں میں طبّی کیمپ لگے اور راشن کی گاڑیاں گھروں تک پہنچنے لگیں۔ مگر اعتماد؟ وہ اب بھی نایاب خزانہ تھا۔

ایک دن گاؤں کی ایک چھوٹی سی بچی زینب، سپاہی ریاض کے پاس آ کر بولی: ”چاچو! آپ سچ میں ہماری حفاظت کے لیے آئے ہیں؟“

سپاہی ریاض نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا ”ہاں بیٹا! جب تک تم سو رہی ہو، ہم جاگ رہے ہیں۔“ اسی شام جب فوج نے گاؤں کے قریب سے بارودی سرنگیں ناکام بنائیں، لوگوں کی آنکھوں سے پہلی بار آنسو نہیں، دُعائیں نکلی۔

مہینوں بعد جب فوج کا وہ یونٹ کام یابی کے بعد اگلی منزل کی طرف روانہ ہو رہا تھا تو گاؤں کے در و دیوار بدل چکے تھے۔ اسکول میں قومی ترانے کی آواز گونجنے لگی تھی، مسجد میں اذان ہوتی، امن کی دعائیں ہوتیں اور ہر گھر میں فوج کا ذکر ایک محافظ کے طور پر ہوتا۔ کمانڈر علی شاہ کی آخری نظر اُس گاؤں پر تھی، جہاں اب بچے ہنستے کھیلتے تھے۔ اُس نے دل میں کہا: ”ہم نے صرف دشمن کو نہیں ہٹایا، بلکہ امید کو واپس لایا ہے۔“

فوجی گاڑیاں دور ہوتی گئیں، گرد آسمان پر اُڑتی رہی۔ پیچھے بچ گیا صرف ایک جذبہ۔۔۔ شکر، خاموشی اور حفاظت کا یقین۔

خاموشی میں لپٹی تھی اس کی وفا کی داستان — وہ گیا تو سہی، مگر آ کر ہو گیا نشان

طرف دیکھا۔

”اور آپ نے کہا تھا صبح و شام کے اذکار ہماری ڈھال کا کام کرتے ہیں۔ یہ بات بھی غلط ہے۔ میں آزما چکا ہوں۔“

”آپ نے کیسے آزمایا؟“ مونا نے معصومیت سے سوال اٹھایا۔

”میں نے کئی بار محسوس کیا ہے، جس دن میں سورۂ یٰسین نہ پڑھوں، میرا وہ دن بنسبت اس دن کے زیادہ اچھا گزرتا ہے، جب میں نے سورت پڑھی ہو۔“ ارحم تیز تیز بول رہا تھا۔ دادی جان خاموشی سے اسے بولتا دیکھ رہی تھیں۔ وہ یہی تو چاہتی تھیں کہ اس کے دل میں جو ہے وہ ظاہر ہو جائے۔

”صبح و شام کے اذکار پڑھنے کے باوجود میرا کوئی نہ کوئی نقصان ہو جاتا ہے۔ کبھی کوئی چوٹ لگ جاتی ہے، کبھی پیسے گم ہو جاتے ہیں، کبھی استاد سے ڈانٹ پڑ جاتی ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے میں نے سورہ یٰسین اور اذکار چھوڑ رکھے ہیں۔ یقین کرو میرا وقت بہت اچھا گزر رہا ہے۔“

”تم یہ بھی تو سوچ سکتے تھے کہ تمہاری قسمت میں کوئی بھاری نقصان لکھا ہوا تھا۔ سورہ یٰسین اور اذکار کی برکت سے وہ بڑا نقصان چھوٹے سے نقصان میں بدل گیا۔“ ارحم نافہم انداز میں دادی جان کی طرف دیکھنے لگا۔ احمد اور مونا جو بھائی کی باتوں پر تذبذب کا شکار ہو رہے تھے۔ دادی جان کی دلیل پر مسکرا دیے۔

”صبح شام کے اذکار کے فوائد: انسان اللہ کی پناہ میں آ جاتا ہے، فرشتے حفاظت کرتے ہیں، آفتوں سے بچ جاتا ہے، برائیوں سے رُک جاتا ہے، اذکار انسان کی بخشش کا ذریعہ ہیں، سب سے بڑھ کر شیطان کے مکر و فریب سے ایک مؤمن اللہ کے ذکر کے ذریعے خود کو بچا لیتا ہے۔“ دادی جان نے ٹھہر ٹھہر کر تمام نکات دہرائے، تاکہ ذہن نشین ہو جائیں۔

”پیارے بیٹے! شیطان تم پر جال پھینک رہا ہے۔ وہ تمہارے اعمال سے خوش نہیں۔ تمہیں وسوسے ڈال کر بہکانا چاہتا ہے اور دیکھو تم بہک رہے ہو، تم اسے کام یابی سے ہم کنار کر رہے ہو۔“ دادی جان نے کچھ توقف کیا۔

ارحم اب پھٹی پھٹی نگاہوں سے دادی جان کو دیکھ رہا تھا۔ بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

”شیطانی وسوسوں کا شکار ہو کر تم قرآن اور اذکار سے دور ہو رہے ہو اور شیطان کو خوش کر رہے ہو۔ وہ ایسے ہی چال چلا کرتا ہے۔ کیا تم حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوّا کا واقعہ بھول چکے ہو؟“

”مجھے معاف کر دیجیے دادی جان!“ مزید کچھ سننے کا اس میں یارا نہ تھا، وہ روتا ہوا دادی سے لپٹ گیا۔

”جب بھی ایسے فضول خیالات ستائیں تعوّذ کثرت سے پڑھا کرو۔“ دادی جان نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے پیار سے نصیحت کی۔ احمد اور مونا نے زیرِ لب اَعُوْذُ بِاللّٰہ پڑھی۔

”مغرب کی نماز کے ساتھ دو نفل توبہ ضرور پڑھ لینا۔“ دادی جان نے جھک کر ارحم کی پیشانی چوم لی۔

سر اٹھا کر دوسرے دونوں بچوں کو بھی اپنے قریب بلا لیا اور بانہوں میں بھر لیا۔

دروازے پر کھڑے ندیم صاحب اس خوب صورت منظر پر بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔

گلاب کی مسکان

حفصہ محمد فیصل

دس برس کا احمد، اپنی ماں اور چھوٹی بہن فاطمہ کے ساتھ ہنسی خوشی ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ احمد بہت نرم دل انسان تھا، لیکن اس کی آواز بہت تیز اور پاٹ دار تھی، جس سے دوسروں کی دل آزاری ہو جاتی تھی۔ وہ یہ بات جانتا تھا، لیکن بدلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ جذبات کو قوت سے جگانا ہی اصل طاقت ہے۔

ایک دن احمد کے اسکول میں ایک مقابلے کا اعلان کیا گیا۔ استاد صاحب نے ہر بچے سے کہا کہ وہ اپنا پسندیدہ موضوع ہارڈ شیٹ پر خوب صورت رائٹنگ میں لکھے گا اور سب کے ساتھ بانٹے گا۔

احمد کا موضوع تھا: "پیار اور نرمی سے بات منوانا۔"

وہ جانتا تھا کام یابی تبھی ملے گی، جب وہ خود اس طریقے پر عمل کرے گا، مگر جب اس نے اونچی آواز میں اپنے خیالات شیئر کیے تو کلاس میں سب بچے اس کی بات سن کر ہنسنے لگے، مگر پھر استاد صاحب نے نرم لہجے میں احمد کو مخاطب کیا: "دیکھو احمد! طاقت کی اصل قدر وہاں ہوتی ہے، جہاں دل نرم ہوں، آواز میں محبت ہو اور ارادے مضبوط ہوں۔" احمد کچھ نا سمجھی کی کیفیت میں سر ہلا کر رہ گیا۔

◆◆◆

احمد جب گھر واپس آیا تو نانی اماں نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا: "بیٹا! جب ہم خیر بانٹیں گے، انسانی دلوں کو چھو کر بات کریں گے، تب ہی ہمیں اصل میں سمجھا جائے گا۔"

نانی اماں نے محبت بھرے لہجے میں ایک مثال دی: "وہ بچہ جس نے اپنی چھوٹی بہن کو ناراض دیکھ کر اپنی پسندیدہ چاکلیٹ اسے دی، نرمی اور سمجھ داری کا پیکر ہوتا ہے۔"

احمد کی آنکھیں اس مثال کو سن کر چمک اٹھیں، کیوں کہ اس نے محسوس کیا کہ نرم انداز ہی دراصل کام یابی کی ضمانت ہے۔

◆◆◆

اگلے دن اسکول پہنچا تو احمد نے عہد کیا: "آج میں نرمی سے سب سے بات کروں گا۔" پہلی صورتِ حال یہ پیش آئی، جب اس کے قریبی دوست علی نے احمد کی آواز کے رعب سے ایک چھوٹی کلاس کے بچے کو ڈرانے کا کہا۔ احمد نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، جس پر علی، احمد سے ناراض ہو گیا۔ احمد نے اس کے پاس نرمی سے جا کر کہا: "علی! میں یہ غلط حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح ہم ایک بچے کو ڈرا کر اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیتے اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔ میں اس بات کو سمجھ چکا ہوں، مجھے امید ہے کہ تم بھی اس بات کو سمجھ جاؤ گے اور آئندہ ایسی غلط حرکت نہ خود کرو گے، نہ مجھے کرنے کو کہو گے۔"

علی کی آنکھوں میں خوشی تھی، وہ ہنس پڑا اور بولا: "چلو کینٹین چلتے ہیں۔" احمد کی یہ پہلی جیت تھی: جذبات کی تسکین اور نرم مزاج کے جنون کی۔

احمد گھر آیا تو فاطمہ نے ایک پینٹنگ بنائی تھی، لیکن رنگوں کا انتخاب اچھا نہیں کیا۔ وہ خوشی خوشی بھائی کو وہ پینٹنگ دکھانے لگی۔

لیکن احمد نے زور سے کہا: "تم اتنا برا کیسے بنا سکتی ہو؟ فاطمہ! یہ تو بھیانک ہے!" بھائی کی بات سن کر فاطمہ رو پڑی۔ احمد کی بات سن کر فاطمہ کا دل دکھا تھا۔ اچانک ہی احمد کے ذہن کے پردے پر نانی کی بات گونجی اور وہ نرمی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"پیاری فاطمہ! تم نے ہلکے رنگ استعمال کیے ہیں، آؤ! میں تمہیں اچھے سے رنگ منتخب کرنے کا طریقہ بتاؤں، جس سے تمہاری یہ پینٹنگ حسین نظر آئے گی اور مجھے امید ہے کہ پھر تم اس پینٹنگ کو اپنے اسکول کے مقابلے میں شامل کر کے انعام بھی حاصل کرو گی۔

فاطمہ مسکرا کر بولی: "ٹھیک ہے، بھائی! آپ مجھے بتائیں۔" احمد نے اس کے ساتھ بیٹھ کر رنگوں کے انتخاب میں مدد کی اور دونوں نے مل کر ایک حسین پھولوں بھرا منظر بنایا۔ اس لمحے نرمی کی وجہ سے دونوں بھائی بہن کا دل خوشی سے بھر گیا۔

◆◆◆

پھر ایک دن استاد صاحب نے اعلان کیا کہ "ہر گروپ کو ایک ٹیم پراجیکٹ کرنا ہے: "خوشی پھیلاؤ' جس میں گلاب کا پھول، امن، پیار، نرمی اور تعاون علامتی نشانی ہیں۔" استاد صاحب نے گروپ تشکیل دیے۔ احمد اپنے گروپ کا لیڈر تھا۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ ہر گروپ ممبر سے محبت بھرا انداز اپنائیں گے اور سب کے خیالات سنیں گے۔

جب کسی گروپ ممبر نے غلط خیال کا اظہار کیا تو احمد نے نرمی سے اس طرح سمجھایا: "دوست! یہ اچھا خیال ہے، اگر ہم اسے مزید بڑھائیں گے تو مزید بہتر ہو سکتا ہے۔ کیا تم چاہو گے کہ ہم اسے خوب صورت رنگوں میں پُر کر کے دکھائیں؟"

اس طرح ہر کسی کو موقع ملا، بھائی چارے کا جذبہ پروان چڑھا اور پیار بھرا ان کا خوب صورت پیغام "امن کا گلاب" کے عنوان سے بہت شاندار طریقے سے پیش کیا گیا۔

◆◆◆

آج اسکول ہال میں پراجیکٹ نمائش تھی۔ احمد کے گروپ کا اسٹال بھی سرخ، سفید، گلابی رنگوں سے سجا تھا۔ اس کے اوپر ایک بڑا گلاب آویزاں تھا، جس پر لکھا تھا: "محبت اور نرمی، سب سے طاقت ور گلاب۔" سب حیرت زدہ تھے، ہر کسی کو احمد کی قیادت اور نرمی سے جیتنے کا پیغام ملا۔

استاد صاحب نے کہا: "اپنے دلوں میں نرمی رکھنے والے لوگ، دنیا بدل سکتے ہیں۔"

اس روز احمد کو "خوشی پھیلاؤ" کا اعزازی انعام ملا اور اس کے دوستوں نے دیکھا کہ جب دوستی میں محبت ہو اور باتوں میں نرمی ہو، تب ہی کام یابی ملتی ہے۔

◆◆◆

احمد جب اسکول سے واپس آیا تو گاؤں میں بھی احمد کی اس تبدیلی کی باتیں ہونے لگیں۔ استاد صاحب کے احمد کے متعلق خوب صورت تاثرات کا چرچا پورے گاؤں میں ہونے لگا: "بہت اچھا لڑکا ہے، نرمی سے خیالات کی پرورش کرتا ہے۔" گاؤں میں بچوں اور بڑوں نے احمد کو مثال قرار دیا اور اس کی گفتگو اور محبت بھرا انداز سب کو متاثر کرنے لگا۔

◆◆◆

کچھ وقت گزرا، احمد نے محسوس کیا کہ اب اس کی آواز میں وہ تیزی نہیں، لیکن اس کی بات دلوں پر اثر کرتی ہے۔ اسے خود بخود اندرونی امن اور خود اعتمادی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے جانا کہ بڑی طاقت وہ نہیں جو زوردار ہوتی ہے، بلکہ وہ ہے جس میں نرمی ہو، محبت سے سبھی کے دل جیتے جا سکتے ہیں اور ہر کسی کا ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پیار اور نرمی ہر بات منوانے کا ہتھیار ہے۔

کرنل شیر خان شہید نشانِ حیدر

عصمت اسامہ

وطنِ عزیز پاکستان کی تاریخ کے اوراق دلیر، جاں بازوں اور بہادروں کی داستانوں سے مزیّن ہیں۔ یہاں ہر سپاہی ایک مجاہد ہے جو ایمان، تقویٰ اور جہاد کے نصب العین کو سینے سے لگائے ہوئے ہے، پھر وہ غازی ٹھہرے یا شہید، دونوں صورتوں میں کام یاب ہے۔ کرنل شیر خان شہید انھی عظیم سپوتوں میں سے ایک ہیں، جنھوں نے 1999ء کی پاکستان ہندوستان کارگل جنگ میں اپنے خون سے شجاعت و جرات کی ایسی داستان لکھی، جس کا اعتراف دشمن ملک بھارت نے بھی کیا۔

بقول شاعر

ساحل کے سکوں سے کسے انکار ہے، لیکن
طوفاں سے لڑنے کا مزا اور ہی کچھ ہے!

کرنل شیر خان یکم جنوری 1970ء کو صوابی (نواں کلی، اب شیر خان کلی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا جان کی تمنّا تھی کہ میرا پوتا ایک دن کرنل بنے، لہٰذا نام ہی "کرنل شیر خان" رکھا۔ وہ بچپن سے ہی جرات، راست گوئی اور بہادری جیسے اوصاف سے متّصف تھے۔ ابتدائی تعلیم صوابی کالج سے حاصل کی۔ 1989ء میں پاک ایئر فورس میں شمولیت اختیار کی۔ 1992ء میں پاک فوج میں افسر بن گئے۔ 1994ء میں سندھ رجمنٹ میں کمیشن حاصل کیا۔ اپنی قابلیت سے جلد ہی ایک مثالی کردار بن گئے۔

کارگل کا معرکہ۔۔۔خون، برف اور غیرت کی جنگ

1999ء کا موسمِ گرما تھا۔ سیاچن اور کارگل کی بلند و بالا پہاڑیاں، جہاں دن میں سورج کی تپش اور رات کو برف کی ٹھنڈ ایک ساتھ حملہ آور ہوتی تھی۔ انہی سرد، بے رحم پہاڑیوں پر کیپٹن شیر خان کو اپنے دستے کے ہم راہ اہم چوٹیوں کا دفاع سونپا گیا۔

ایک خاموش رات تھی۔ چوٹی پر سپاہی الرٹ تھے۔ اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی، بھارتی فوج نے بھرپور حملہ کیا تھا۔ کیپٹن شیر خان نے اپنی بندوق تھامی، مورچوں سے آواز دی:

"سپاہیو! پیچھے نہیں ہٹنا!" سپاہیوں کے حوصلے بلند ہوئے۔ دشمن کئی گنا زیادہ تھا، مگر جوابی فائرنگ نے ان کی پیش قدمی روک دی۔ شیر خان خود اگلی لائن پر لڑ رہے تھے۔

وہ خود اگلے مورچے پر پہنچے اور کہا: "ہمیں آگے بڑھ کر ان کے دل میں خوف پیدا کرنا ہے!"

شیر خان کی قیادت میں برف سے ڈھکی پہاڑیوں پر، زنجیرِ واحد کی کڑیوں کی مانند متحد سپاہی (جن کی تعداد اکیس بتائی جاتی ہے) برستی گولیوں کے درمیان دشمن پر ٹوٹ پڑے اور کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ ان کی توجہ کا مرکز دشمن کے امدادی سامان کے راستے کو مسدود کرنا تھا۔ دشمن بھی حیران تھا کہ تقریباً 17000 فٹ کی بلندی پر واقع ٹائیگر ہل پر کون سا شیر آن بیٹھا ہے!

کرنل شیر خان نے ان کی آرٹلری کا بہت نقصان کیا۔ دشمن کی ایک رجمنٹ آگے آتی تھی، شیر خان اس کا صفایا کرتے تھے، پھر دوسری رجمنٹ آجاتی تھی، وہ ختم کرتے تھے، یہ سلسلہ یوں ہی جاری تھا۔ ایک وقت آیا کہ کرنل شیر خان کے سب ساتھی شہید ہوگئے، لیکن انھوں نے اکیلے ہی مقابلہ جاری رکھا۔ آپ کے کمانڈنگ آفیسر نے بتایا کہ تقریباً ساٹھ سے ستر ہندوستانی سپاہی آپ کے ارد گرد پوزیشن لے رہے ہیں۔

جو حق کی خاطر جیتے ہیں، مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقتِ شہادت آتا ہے، دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں!

5 جولائی کو دشمن نے کرنل شیر خان پر فاؤنٹین اٹیک یعنی محاصرے میں حملہ کیا اور آپ جامِ شہادت نوش فرما گئے۔ ان کی شہادت کے بعد بھارتی سپاہی یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تنہا سپاہی نے پوری بھارتی فوج کی یلغار کو روک رکھا تھا۔

بھارتی فوج کا اعتراف

یہ پہلا موقع تھا کہ دشمن فوج نے خود خط لکھ کر پاکستانی شیر کی بہادری کا اعتراف کیا۔ بھارتی کمانڈر نے لکھا:

"ہم نے شیر خان جیسے دلیر دشمن کا پہلے کبھی سامنا نہیں کیا۔ وہ دشمن ہوتے ہوئے بھی قابلِ احترام ہے۔"

نشانِ حیدر اور قومی خراجِ تحسین

حکومتِ پاکستان نے ان کی بے مثال قربانی، جرات و شجاعت پر نشانِ حیدر کا اعلان کیا۔ ان کی قبر صوابی میں واقع ہے، جہاں ہر سال ہزاروں لوگ فاتحہ خوانی کے لیے آتے ہیں۔ اسکول، شاہراہیں اور یادگاریں ان کے نام سے منسوب کی گئی، ہیں تاکہ آنے والی نسلیں ان کا نام یاد رکھیں۔

کرنل شیر خان شہید نہ صرف وطن کے محافظ تھے، بلکہ پاکستان کے تشخّص، غیرت و استقلال اور مزاحمت کی علامت تھے۔ انھوں نے ہمیں سکھایا کہ میدانِ جنگ میں فوجیوں کی تعداد نہیں، بلکہ ایمان، عزیمت اور جذبہ فیصلہ کرتا ہے۔ ان کا خون وطن کی مٹی میں جذب ہو کر آج بھی ہماری سرحدوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ زندہ قومیں اپنے محسنوں کو ہمیشہ یاد رکھا کرتی ہیں۔ کرنل شیر خان کا نام تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا!

محبت زبان سے، لہجے سے اور الفاظ سے کرنی چاہیے۔
نرمی میں قوّت ہوتی ہے، زبردستی میں زہر۔
سمجھ داری اور احترام ہر رشتے کو مضبوط بناتا ہے۔
تعاون اور محبت سے لوگ خود بدلنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

احمد یہ اسباق لے کر آگے بڑھتا گیا۔ گاؤں اور اسکول میں سب اس کے گرویدہ بن گئے اور جب وہ بڑا ہو کر گاؤں کا بڑا آدمی بنا، تب بھی اس نے یہی راستہ اپنایا کہ ریاست کا اقتدار نہیں، نرمی، پیار اور انسانیت کا اقتدار اصل کام یابی ہے۔

بچو! یہ کہانی ہمیں سکھاتی ہے کہ: زور سے بات کرنے سے کام نہیں بنتا، نرمی سے ہوتا ہے۔
جیسے ندی کا پانی چٹان کو گھرا کرتا ہے، اسی طرح محبت بانٹ کر دلوں تک رسائی ہوتی ہے۔
اپنی رائے پیار اور احترام سے رکھو۔۔۔ لوگ تمہیں سنیں گے، تمہیں قبول کریں گے۔
قیادت بھی نرم دلی سے ہوتی ہے، سختی سے نہیں۔۔۔ سمجھ داری سے ملتی ہے کام یابی۔

اگر تمہیں کسی سے اختلاف ہو یا کوئی ناراض ہو تو احمد کی طرح دوستی، نرمی اور سمجھ داری آزما کر دیکھو۔ اچھا جواب ملے گا۔ اگر تمہیں کبھی محسوس ہو کہ تمہارے اندر سے نرمی نکلی جا رہی ہے تو بس ایک لمحہ اپنے دل پر ہاتھ رکھو اور پوچھو: "کیا یہ الفاظ میرے دل سے آرہے ہیں یا دماغ سے؟" نرم دلی اور محبت کے لمس کو محسوس کر کے زندگی بھر اس پر عمل کرو۔

اللہ! ہم سب کو نرمی اور محبت سے بات کرنا سکھائے۔ آمین!!

بابائے قوم کا فرمان

فاکہہ قمر

”آج ہم پڑھیں گے بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کے بارے میں۔“ مس فرح نے اردو کی کتاب کھول کر عنوان دیکھتے ہوئے کہا۔

”مس فتح! یہ تو ہم بچپن سے پڑھتے آرہے ہیں۔“ ایمن نے منہ بنا کر کہا۔ ”بلکہ اب تو یہ مضمون اچھی طرح یاد ہو گیا ہے۔“ زارا نے بھی فوراً اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”واقعی؟ ارے واہ!! چلیں پھر بتائیں کہ قائداعظم نے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کیا کہا تھا؟“ مس فرح نے پوچھا۔

”خطاب؟“ عینی کا منہ کھل گیا۔ میرا تو خیال ہے قائداعظم نے نوجوانوں سے کبھی کوئی خطاب کیا ہی نہیں تھا۔“ ایمن نے بہت سوچ سمجھ کر کہا۔

”اچھا!! لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے، آپ کے علم میں نہ ہو، جب کہ سچ تو یہ ہے ایسا ہوا ہے۔“ مس فرح نے ایمن کو چشمے کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے کہا۔

”جی مس آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، میرے علم میں نہیں ہے۔“ یمن نے فوراً ہی ہار تسلیم کر لی تھی۔

”چلیے میں آج آپ کو بتاتی ہوں کہ جب تحریکِ آزادی عروج پر تھی اور نوجوان اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ ایسے میں قائداعظم نے نوجوان طالب علموں کا خون گرمانے کے لیے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ: ”دنیا میں وہی قومیں ترقی کرتی ہیں، جن کے نوجوان تعلیم یافتہ، محنتی اور باکردار ہوں“۔ اس خطاب میں انھوں نے نوجوانوں کو محنت و عزم کے ساتھ کام کرنے کی تلقین کی تھی۔“ مس فرح نے تفصیل سے بتایا۔

”اوہ!! میں تو سمجھتی تھی کہ قائداعظم نے بس یہی فرمایا ہے کہ: ”کام، کام اور صرف کام۔“ ایمن نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

”جی میں نے بھی یہی سنا اور پڑھا ہے لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ کون سا کام کرنا ہے بلکہ میں تو یہ بھی سوچتی رہتی ہوں کاش قائد بتا جاتے ہم نے کیا کرنا ہے تو کم از کم ہمیشہ وہی کام کرتی رہتی لیکن قائداعظم نے کام کا تو بتایا ہی نہیں۔“ زارا کی بات پر پوری کلاس ہنسنے لگی۔

”یہ قائداعظم کا مشہور قول ہے لیکن آپ نے نامکمل پڑھا ہے۔ یہ پورا قول کچھ اس طرح سے ہے: کام، کام اور بس کام محنت، دیانت اور لگن کے ساتھ۔“ میڈم فرح کی باتوں سے اب بچے کچھ دلچسپی محسوس کر رہے تھے۔

”میڈم!!! کیا قائداعظم کے اور بھی اقوال ہیں؟“ آئمہ نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔“

”جی بیٹا! بابائے قوم نے ہماری ہمت بڑھانے کے لیے بہت سے اقوال کے ذریعے ہمیں پیغام دیا ہے۔ میڈم فرح کے بتانے پر سب بچے حیران رہ گئے کیونکہ آج سے پہلے وہ یہ سب نہیں جانتے تھے۔“

”میڈم!!! آپ ہمیں بتائیں اور کون کون سے اقوال ہیں؟“ زارا نے چھوٹے بچے کی طرح فرمائش کی جس پر میڈم مسکرا اٹھیں۔ اور کہنے لگیں: ”چلیے!! میں کچھ مشہور اقوال آپ لوگوں کو سناتی ہوں۔“ تمام بچے اپنی کاپی اور قلم کو سنبھال کر ایک دم الرٹ ہو کر بیٹھ گئے۔

”قائدِاعظم نے ہمیشہ ہمارے حوصلے بلند کیے اور ان کے یہ اقوال آج بھی اپنے اندر وہی طاقت اور جوش رکھتے ہیں جو ماضی میں تھے۔ ان کا سب سے پسندیدہ قول یہ ہے: ”دنیا میں کوئی طاقت ہمیں مٹا نہیں سکتی۔“

”اسی طرح ان کا ایک قول یہ ہے: ”قومیں قربانیوں سے بنتی ہیں۔“

”ایک اور جگہ انہوں نے فرمایا تھا: ”تعلیم کے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی۔“

”سب سے زیادہ اہم ان کا یہ قول ہے جس پر ہم سب کو عمل کرنے کی ضرورت ہے۔“ یاد رکھو، تم دنیا کی ایک عظیم قوم ہو۔“ اسی طرح انہوں نے مختلف مواقع پر بہت سے اقوال کہے جو سالوں گزر جانے کے بعد بالکل ویسے ہی زندہ ہیں۔“ میڈم فرح کے بات کرتے ہوئے پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔

”ٹھیک ہے بچو! اب آپ کا کام یہی ہے کہ آپ قائدِاعظم کے مزید اقوال تلاش کریں اور انھیں اپنی کاپی میں لکھ کر لائیں۔ ہم کل اس سبق کو مکمل کریں گے۔“ یہ کہہ کر میڈم فرح کلاس سے باہر چلی گئیں اور سب بچے کل کے لیے دیا گیا کام حل کرنے کا سوچ کر مسکرانے لگے۔

بقیہ

تیسری شے

”جج جی۔۔۔؟“ المیر کو کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس نے ہمدردی سے اپنی زوجہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے سوال کیا: ”تابندہ کیا ہوا ہے؟“ آنسوؤں کا نہ رُکنے والا سیلاب تھا جو تابندہ کی آنکھوں سے رواں تھا۔ کچھ دیر ہچکیوں سے وہ روتی رہی اور المیر حیران و پریشان خاموشی سے اسے تکتا رہا۔

”المیر! آپ بظاہر تو میرے ساتھ ہیں، مگر پورے دل و دماغ سے میری طرف متوجہ نہیں ہیں۔ آپ پہلے میری طرف دیکھ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غور سے بات سنتے اور جواب دیتے تھے، مگر اب ایک بات دو یا تین بار دہرانے پر بھی جواب ”ہوں یا ہاں“ میں آتا ہے یا پھر کچھ مختصر سا کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں۔ گویا آپ مجھ سے بیزار ہیں۔“ علیزا نے ایک ہی سانس میں سب کہہ ڈالا۔

”کک کیا؟ ہماری بیگم کو ایسا لگتا ہے؟ بھلا میں کیوں تم سے بیزار ہونے لگا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اب المیر پوری توجہ سے علیزا سے مخاطب تھا۔

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو یہ موبائل ہمارا رشتہ کمزور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے رشتہ میں کوئی دراڑ آئے؟؟“ علیزا فکرمندی سے بولی تھی۔

”نن نہیں، ہرگز نہیں۔۔۔“

”تو پھر آپ کو ہمارے رشتے سے اس تیسری شے کو ختم کرنا ہوگا۔“ اب علیزا کی بات المیر کو سمجھ میں آنے لگی تھی۔

”ٹھیک ہے علیزا! اب جہاں میں اور تم ہوں، وہاں ہم دو ہی ہوں گے۔ اُس وقت میں موبائل کا استعمال نہیں کروں گا۔“

”شکریہ میری بات سمجھنے کے لیے۔“ علیزا شکر گزار ہوئی۔

”بلکہ ہماری زوجہ محترمہ کا شکریہ کہ جنھوں نے میری اصلاح کر دی اور ہمارے رشتے کی پائیداری کا خیال رکھا۔“

”نہیں سرتاج!! ہم دونوں کو اللہ ربُّ العزت کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ جس نے ہمارے درمیان آنے والے خلا سے ہمیں محفوظ رکھا۔ الحمدللہ!!“

جناح کا سپاہی

قانتہ رابعہ

”داداجان، پلیز میری ہیلپ تو کردیں، پلیز!“نعمان نے دادا ابو سے کہا ہمارے اسکول میں ایک تقریری مقابلہ ہے، جس کا موضوع ہے: ”میری جان پاکستان!“

”دادا جی میری کوئی کھاس تیاری نہیں، مجھے معلوم نہیں تقریر کی تیاری کیسے کرتے ہیں۔ بابا کو کہا تو ان کو گسّا آگیا۔ پلیز مجھے بہت ٹینشن ہے، صرف دو دن رہ گئے ہیں۔“

دادا نے اسے پاس بٹھایا اور پیار سے پوچھا: ”بیٹے! ہندوستان میں کون لوگ رہتے ہیں؟“

”دادا ابو! آپ کو کیا ہو گیا ہے، آپ کو نہیں معلوم وہاں ہندو رہتے ہیں!“نومی نے حیرت سے جواب دیا۔

”اچھا۔۔۔! بچے یہ تو بتاؤ کہ ہندو کون سی زبان بولتے ہیں؟“ دادا ابو نے معصومیت سے پوچھا۔

”اف۔۔۔ دادا ابو کیا ہو گیا ہے آپ کو! سارے ہندو اپنی زبان ہندی بولتے ہیں۔“نومی نے سر پکڑ کہا۔

”اچھا۔۔۔! تو اب یہ بھی بتادو بچے کہ سعودی عرب میں کون سی قوم آباد ہے اور ان کی کون سی قومی زبان ہے؟“ دادا ابو نے پھر عجیب سا سوال کیا۔

بیچارے نومی کو کیا پتا کہ سرکاری اسکول میں چالیس سال اردو پڑھانے والے دادا ابو یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں!

اس نے جواب دیا: ”سب کو پتا ہے، وہاں عرب قوم آباد ہے اور ظاہر ہے عربی زبان بولتی ہے۔“ دادا ابو مسکرائے۔

جیسے ہندوستان میں ہندو رہتے ہیں اور ہندی بولی جاتی ہے۔ سعودی عرب میں عرب رہتے ہیں عربی بولی جاتی ہے، لیکن پاکستان وہ ملک ہے یہاں کی قومی زبان تو اردو ہے، لیکن اردو میں آدھی انگریزی اور آدھی ہندی ملا کر بولی جاتی ہے، جبکہ تمہاری تقریر کا جو موضوع ہے: ”میری جان پاکستان“ کا تو مطلب ہے ہم اردو میں کوئی دوسری زبان کی ملاوٹ نہ کریں۔ ہمارے شادی بیاہ ہمارے اپنے طریقے سے ہوں اور ہم اس کی محبت میں اس کی بھلائی کے لیے سوچیں۔ ڈرامے فلمیں ہندی کی دیکھیں، شادی بیاہ میں ساری رسمیں ان کی، زبان آدھی ہندی آدھی انگریزی اور تقریر کریں گے ”میری جان ہے پاکستان۔۔۔“

”واہ میاں! کیا بات ہے۔“ دادا ابو نے سنجیدگی سے کہا۔

”لیکن دادا ابو! میں نے تو آپ سے کبھی ہندی میں بات نہیں کی، نہ ہی اس کی کھاس۔۔۔“ دیکھا تم نے! ہمیں معلوم بھی نہیں ہوتا اور ہماری بات میں ہندی ڈرامے اور فلمیں اپنا رنگ دِکھا جاتی ہیں۔

یہ جو تم خاص کو کھاس، غصے کو گصہ اور خالہ کو کھالہ کہتے ہو، یہ کیا ہے۔۔۔؟ نہیں بیٹے! تقریر کا موضوع بدلو: ”میری جان ہے ہندوستان۔“ ٹھیک ہے نا۔۔۔ ارے بے سمجھ بچو! محمد علی جناح کو کیا ضرورت پڑی تھی الگ ملک لینے کی؟ کیوں اتنی محنت کی؟ لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے، جان سے گئے۔ اگر ان کی ہی رسمیں اپنانا تھی، ان کی زبان بولنا تھی، ان کے ڈرامے دیکھنا تھے تو کیا ضرورت تھی۔۔۔؟ وہیں ہندوستان میں گائے کا پیشاب پینے، گائے کو ماں کہنے والوں کے ساتھ رہتے۔ کم از کم قائد کو تو روزِ قیامت شرمندہ نہ ہونا پڑتا، جنھوں نے اپنی تقریروں میں کئی مرتبہ اسلام کو نئے ملک کا مکمل ضابطۂ حیات اور اردو زبان کو سرکاری زبان قرار دینے کا اعلان کیا تھا!

نعمان کا شرمندگی سے سر جھک گیا۔ ”کہتے تو دادا ٹھیک ہیں، بس یاد ہی نہیں رہتا۔ اب پکی توبہ ہندی ڈرامے دیکھنے ہیں نہ ان کی زبان کا اثر لینا ہے۔“

اسے سر جھکائے دیکھ کر سوچوں میں مگن دیکھ کر دادا ابو نے پوچھا: ”کیوں نعمان بیٹا! خاموش کیوں ہو؟ کیا میری باتیں بری لگی ہیں؟“

”نہیں دادا ابو! بری تو نہیں لگیں، لیکن باتیں ساری ٹھیک ہیں۔ پتا نہیں خود بخود کیسے ہندی کے الفاظ گفتگو میں گھس جاتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا، بس اب ان شاء اللہ جرور۔ اوہ سوری، سوری۔ ہائے یہ بھی تو انگریزی میں ہی ہے، نہیں نہیں، معذرت! اب ضرور کوشش کروں گا۔“ ہکلاتے ہوئے نعمان نے بات مکمل کی تو دادا ابو نے پھر اسے گلے لگایا۔ انھیں پتا چل گیا تھا کہ بچے کو بات سمجھ میں آگئی ہے۔ اب ان شاء اللہ جناح کا سپاہی ہی بنے گا۔

مری یادوں میں رہتا ہے

شمائلہ شکیل

نظر آتا وہ دکھتا ہے
خوشی سے مسکراتا ہے
اٹھارہ سال پہلے کے
مرے ماضی میں بستا ہے
ذہانت سے بھری آنکھیں
شرارت سے سجاتا ہے
یہاں چلتا وہاں پھرتا
کبھی نظمیں سناتا ہے
کہیں جگنو کہیں تتلی
بنا اُڑتا، اچھلتا ہے
اگر سویا ہوا دیکھو
بڑا معصوم لگتا ہے
مری سوچوں، خیالوں میں
مُجسّم چلتا پھرتا ہے
بنا چھوئے میں کہتی ہوں
وہ دیکھو سانس لیتا ہے
اِنہی صحنوں، دالانوں میں
سبھی کے بیچ جیتا ہے
”اُنس“ ایسے ہمیشہ ہی
مری یادوں میں رہتا ہے

بچوں کے فن پارے

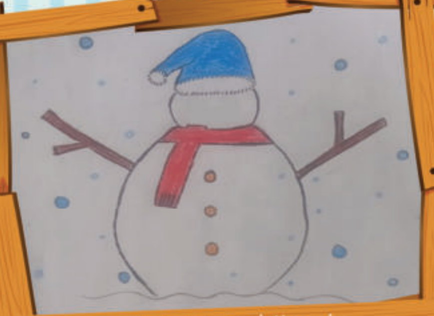

خدیجہ اشرف 12 سال ، اسلام آباد

حنظلہ اویس 7 سال ریاض سعودی عرب

سبیحہ یونس ،11 سال لاہور

دانیال حسن ،11 سال،پنجم ، شنکیاری مانسہرہ

عائشہ منہاج 12 سال کراچی

عائشہ گوہر 12 سال اسلام آباد

محمد خزیمہ ،ہفتم ،14 سال ، شنکیاری مانسہرہ

ماہ نور نواز 7 سال کراچی

ہر ماہ ایک فن پارے پر300 روپےانعام دیا جاتا ہے گزشتہ ماہ کراچی سے **خدیجہ دانش** کا فن پارہ انعامی قرار پایا ہے، انہیں 300 روپے مبارک ہوں (ادارہ)

ماہنامہ فہم دین دسمبر 2025ء کے سوالات

سوال1: منے میاں کے پسندیدہ ادیب کون تھے؟

سوال2: اقبال رحمہ اللہ کا فلسفہ خودی کس چیز کا نچوڑ ہے؟

سوال3: عائزہ کی عمر کیا تھی؟

سوال4: خزاں کا موسم کس موسم کے بعد آتا ہے؟

سوال5: ریاضی کے پیریڈ کے بعد بچے کیا محسوس کر رہے تھے؟

یہ سوالات نومبر 2025 کے فہم دین سے لیے گئے ہیں۔
جوابات کی آخری تاریخ 15 دسمبر 2025ء ہے

نومبر 2025ء کے سوالات کے جوابات

1-: جادوگر

2- ہار نہ مان کر مشکلات کا مقابلہ کرنا

3- نور پور

4- باہر کا گندا کھانا کھا کر

5- صدقہ

چھوٹی بات بڑا پیغام

پیارے بچو!

ہم سب اپنے پیارے قائد، قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ سے بے حد محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ ہمارے قائد نظم و ضبط، صفائی اور وقت کی پابندی کی روشن مثال تھے۔ وہ اپنی ہر چیز سلیقے سے رکھتے اور کبھی وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ یہ اور ایسی بے شمار خوبیوں نے انہیں ایک مضبوط اور باوقار رہنما بنایا، لیکن یہ کیا کہ پیارے قائد کی قوم کے بہت سے بچے اپنی چیزیں ترتیب سے نہیں رکھتے۔ بے ترتیب ہونے کی وجہ سے چیزیں گم ہو جاتی ہیں اور ضرورت کے وقت انہیں ڈھونڈنے میں قیمتی وقت ضائع ہوتا ہے۔

یاد رکھیں! جو بچہ چھوٹا سا کام ٹھیک سے نہیں کر پاتا، وہ بڑا کام کبھی بھی اچھی طرح نہیں کر سکتا۔

اس دسمبر میں اپنے پیارے قائد کو خراج عقیدت ایک اچھی عادت اپنا کر پیش کریں: اپنی کتابیں، جرابیں، اسٹیشنری اور کپڑے خود ترتیب سے رکھیں، جو بچہ اپنی چھوٹی ذمہ داریاں پوری کرنا سیکھ لیتا ہے، وہی مستقبل میں بڑا اور باوقار انسان بنتا ہے—بالکل قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی طرح۔

کریں گے نا!!!!

نومبر 2025ء کے سوالات کا درست جواب دینے پر اسلام آباد سے
محمد حارث
انعام کے حق دار ٹھہرے ہیں۔
انھیں 300 روپے مبارک ہوں

سنیے!!!!

انعامی سوالات کے جوابات بھیجنا ہوں یا فن پارہ، اپنا نام، عمر، کلاس اسکول/مدرسے کا نام اور رابطے کے لیے موبائل نمبر ضرور لکھیں۔ جوابات اور فن پارہ بھیجنے کے لیے ای میل اور وٹس ایپ نمبر نوٹ کر لیں:

tabeer1387@gmail.com

+923351135011

واقعہ طائف

حافظہ سویرا چودھری حافظہ وسطیٰ چودھری

تخیّل میں وہ لمحہ ہے کہ دل بے چین ہو جائے
یہ آنکھیں بھیگ سی جائیں، سکونِ جاں بھی کھو جائے

نبوت کا یہ دسواں سال تھا شوّال کا آخر
بہت ہی بڑھ چکے تھے دشمنی میں مشرک و کافر

یہ عام الحزن تھا لوگو! جدائی آگئی غالب
ہوئے رخصت تھے دنیا سے خدیجہ اور ابو طالب

نبی کے غم گساروں نے جہاں سے کُوچ فرمایا
تو اُن سا کوئی بھی ہمدم نظر بالکل نہ پھر آیا

یہ وہ پیارے تھے آقا کے جو دکھ میں ساتھ ہوتے تھے
تسلی اور دِلاسے کا ہمیشہ ہاتھ ہوتے تھے

مبارک دل نبی جی کا حزیں تھا اور، پریشاں تھا
جو غفلت میں پڑے تھے اُن کو سمجھانا نہ آساں تھا

خدا سے تھی بغاوت اور جہالت کی ستائش تھی
رسالت کے ہر اک رستے میں تنگی آزمائش تھی

ستم بڑھنے لگا بے حد، تھی ہر جا برہمی پائی
تو طائف میں کرن امید کی پھر اک نظر آئی

یہ ممکن ہے کہ باتیں حق کی، ظلمت چیر ڈالیں گی
جہاں نرمی دکھائی دی، وہیں پر رہ بنا لیں گی

خدا کا نام لے کر جب سفر طائف کا فرمایا
تو حضرت زید کو آقا نے اس دم ساتھ تھا پایا

توقُّع لے کے آئے تھے کلامِ حق سنانے کی
خدا کے باغی بندوں کو خدا سے ہی ملانے کی

نبی کا نرم لہجہ اُن کے پتھر دل سے ٹکرایا
مگر اُن کے دلوں کا قفل پھر بھی کھل نہیں پایا

عداوت بے رخی تھی اور نگاہوں میں تمسخُر تھا
لبوں پر طنزیہ جملے حقارت تھی تکبّر تھا

نہ کوئی شرم تھی اُن میں نہ پاسِ میزبانی تھا
ہر اک ہی دوسرے سے بڑھ کے کرتا بدزبانی تھا

کہا سردار نے اُن سے: نبی تم کو بنایا ہے؟
خدا کو دوسرا کوئی بشر کیا مل نہ پایا ہے؟

ہتک آمیز لہجے میں ہی تھا پھر دوسرا بولا
لبوں کو تیسرے نے بھی جہالت میں ہی تھا کھولا

نہ کر پائی اثر اُن پر کلامِ حق کی حدّت بھی
اتر آئی تھی گستاخی میں اُن کی اور شِدّت بھی

پکارا تھا جوانوں کو شریروں کو بھی اُکسایا
ہجومِ جاہلاں اک تھا نبی کے پیچھے پھر آیا

کوئی کستا تھا آوازے، کسی نے سنگ برسائے
خدایا آہ! وہ منظر بیاں کیوں کر وہ ہو پائے؟

بڑے بے رحم لوگوں نے ستم کی انتہا کی تھی
نہ دامن صبر کا چھوٹا، نہ لب پر شکوہ ہی آیا
بڑے تکلیف دہ لمحے تھے آقا بیٹھ جاتے تھے
وہیں پر زید ابنِ حارثہ ڈٹ کر رہے واللہ
کہ جتنے سنگ آتے تھے بدن پر اپنے پاتے تھے
مگر صد حیف پھر بھی مصطفیٰ کو زخم آئے تھے
ہوئے واپس تورَہ میں پھر ملی برہم فَضائیں تھیں
میں اپنی بے بسی یارب فقط تجھ کو سناتا ہوں
غضب تیرا نہ ہو مجھ پر نہ اترے تیری ناراضی
جو دیکھی اس قدر مظلومیت اور مُضمحِل شانے
لیے انگوروں کا گچھا تھا پھر اک نوجواں آیا
سنا جب مصطفی سے نام یہ حیرت سے وہ بولا
نبی جی کے وہ استفِسار پر گویا ہوا تھا یوں
تو فرمایا وہاں پر تھے نبی یونس رہا کرتے
یہ فرمایا نبی نے تو زمین و آسماں جھومے
مگر جو اُس کے مالک تھے اُنھوں نے حق نہ پہچانا
بہت امید لائے تھے، پریشاں حال جاتے ہیں
اٹھی نظریں تو دیکھا حضرتِ جبریل آئے ہیں
فرشتے نے کہا: گر مصطفیٰ کا حکم ہو جائے
مبارک دل نبی جی کا ہوا بے تاب تھا اُس دم
کہا ہرگز نہیں میں چاہتا اُن کی تباہی کو
کہ اِن کی نسل میں شاید کوئی اسلام لے آئے
زباں ہے گنگ! ایسے ضبط، ایسے صبر پر واللہ
وہ ہادی، رہنما، محسن بڑی ہی آن والے ہیں

نہ پھر بھی محسنِ انسانیت نے بد دعا دی تھی
تحمّل در گزر ایسا جہاں میں کس نے ہے پایا؟
وہ ظالم سرکشی میں غرق تھے، پھر سے اُٹھاتے تھے
تمنا تھی سلامت ہی رہیں پیارے رسول اللہ
نبی جی کی محبت میں وہ اپنی جاں لٹاتے تھے
ملامت کی، نہ ہی نفرین میں لب ہی ہلائے تھے
نبی جی کی زباں پر بس یہی آتی دعائیں تھیں
نگاہوں میں جو بے قدری ہے اُس کا دکھ اٹھاتا ہوں
مرے مولا! یہ چاہت ہے رہے بس مجھ سے تو راضی
تو بھیجا اپنا خادم اُن کی جانب عتبہ شیبہ نے
خدا کا نام لے کر ہی نبی نے اس کو تھا کھایا
کہاں سے آپ آئے؟ کون ہے یہ آپ کا مولا؟
میں نصرانی ہوں، بستی نینویٰ کا رہنے والا ہوں
میں اُن کا بھائی ہوں، وہ بھی تھے رب کو اک کہا کرتے
کہ آگے بڑھ کے خادم نے قدم آقا کے تھے چومے
مناسب ہی لگا آقا کو پھر واپس چلے آنا
بھلا پوچھے کوئی اُن سے: کسی کو یوں ستاتے ہیں؟
پہاڑوں کا فرشتہ ساتھ بھی اپنے وہ لائے ہیں
کچل ڈالوں پہاڑوں میں، یہ بستی ہوش کھو جائے
تڑپ اٹھتی تھی سینے میں، لیے امت کا تھے وہ غم
عجب کیا ہے مٹا دے گا، خدا دل کی سیاہی کو
خدا کا نام لے کر دین کو دنیا میں پھیلائے
فدا نفسی، فدا قلبی، فدا روحی رسول اللہ
نبی وُسطیٰ سویرا کے، بڑی ہی شان والے ہیں

قلم پارے

ترتیب: محمود سیماب

مختصر و پر اثر تحریروں کا سلسلہ، اس ماہ کی انعامی تحریر کراچی سے عذرا خالد کی طے پائی ہے

فضولیات سے پرہیز

شاکرہ حافظ یاسین

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو سرمایہ اور صلاحیتیں انسان کو عطا کی ہیں ان کو لایعنی، یعنی فضول اور غیر مفید کاموں سے بچانا چاہیے، ان بے فائدہ کاموں میں پڑنے سے نیکیوں کی رونق جاتی رہتی ہے۔

حدیث نبوی ہے ! انسان کے اسلام کی ایک خوبی بے فائدہ چیزوں کو چھوڑ دینا ہے۔

حضرت لقمان حکیم سے پوچھا گیا: آپ کو یہ حکمت کیسے نصیب ہوئی؟

فرمایا: سچ بولنے، امانت ادا کرنے اور فضولیات سے خود کو بچانے پر۔

ملال و اکتاہٹ کیا ہے؟

سمعیہ رحمت زمان

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ایک خچر پر سوار تھے۔ کسی نے کہا: آپ مصر کے معزز ترین افراد میں ہیں، پھر بھی اس پر سوار ہوتے ہیں

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

☆میں اپنے کپڑے سے نہیں اُکتاتا جب تک وہ مجھے (ڈھانپنے میں) کافی ہے۔

☆اپنی بیوی سے نہیں اُکتاتا جب تک وہ میرے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے۔

☆اپنی سواری سے نہیں اُکتاتا جب تک وہ مجھے سوار کرے۔

☆نہ ہی اپنے دوست سے جب تک وہ میرا راز چھپاتا ہے۔

بے شک اُکتاہٹ (ملال) بدترین اخلاق میں سے ہے۔

وہ خسارے میں ہے

حرا عبدالرحمٰن

ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وہ شخص خسارے میں ہے جو لوگوں کے سامنے اپنے نیک عمل ظاہر کرے اور اپنے رب کی نافرمانی کرے جو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ (حلیۃ الأولیاء)

پرایا حق

عطیہ عمیر منصوری

گئے وقتوں کی بات ہے، ایک دفعہ رانی اپنی امی کے ہمراہ کھیتوں کی طرف گئی۔ وہاں کسی کے کھیت میں سے گنا توڑنے لگی۔ اس کی والدہ نے کہا، "بیٹا! اس طرح بغیر اجازت کے کسی کی کوئی چیز نہیں لیتے، یہ چوری کہلائے گی۔" بیٹی بولی، "امی جان، کچھ نہیں ہوتا۔" ماں نے کہا! "غاصب اللہ اور رسول کے نزدیک بہت برا ہوتا ہے، جو شخص کسی کا حق کھائے گا قیامت کے دن اسے واپس لوٹانا پڑے گا۔" بچی نے فوراً گنا وہیں چھوڑ دیا۔

مومن کی صفات

خدیجہ حیات

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جس شخص میں یہ تین صفات ہوں، وہ کامل مومن ہے:

۱. غصے میں اللہ کی فرماں برداری نہ چھوڑتا ہو۔　۲. اور خوشی میں اللہ کی نافرمانی نہ کرتا ہو۔　۳: اور جب بدلہ لینے پر قادر ہو تو وہ عفو و درگزر کا معاملہ کرتا ہو، انتقام نہ لے۔

اشعار اور قارئین کی پسند

آگہی کرب وفا صبر تمنا احساس
میرے ہی سینے میں اترے ہیں یہ خنجر سارے

شاعر: بشیر فاروقی انتخاب: بدر منیر کراچی

وہاں سے ہے مری ہمت کی ابتدا واللہ
جو انتہا ہے ترے صبر آزمانے کی

شاعر: جوش ملیح آبادی انتخاب: سمیہ رفیق فیصل آباد

کل جو تھا وہ آج نہیں جو آج ہے کل مٹ جائے گا
روکھی سوکھی جو مل جائے شکر کرو تو بہتر ہے

شاعر: ناصر کاظمی انتخاب: فہمیدہ عبید کراچی

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

شاعر: علامہ اقبال انتخاب: نقیب اللہ راولپنڈی

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

شاعر: فیض احمد فیض انتخاب: محمد اسجد حیدر آباد

اشعار اور قارئین کی پسند

وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

شاعر: ساحر لدھیانوی انتخاب: فقیر محمد پشاور

برباد، گلستاں کرنے کو بس ایک ہی الو کافی تھا
ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا

شاعر: شوق بہرائچی انتخاب: روبینہ ہاشمی اسلام آباد

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

شاعر: ناطق لکھنوی انتخاب: مدثر فاروق کراچی

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

شاعر: مرزا غالب انتخاب: فریدہ فرید کراچی

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

شاعر: وسیم بریلوی انتخاب: انتخاب: مریم ندیم ایبٹ آباد

تعاون کریں ثواب پائیں

عذرا خالد کراچی

خواتین نیک اعمال میں گھر کے مردوں کو نیک کام میں ابھارنے، ترغیب دینے اور نیک اعمال کی انجام دہی میں تعاون کر کے ثواب میں شریک ہو سکتی ہیں: مثلاً:

☆ روزوں خصوصاً نفلی روزوں میں ان کے لیے سحری افطاری کا اہتمام کر کے

☆ جمعے اور عیدین کی نمازوں میں شرکت کے لیے بروقت تیار ہونے اور پہنچنے کے لیے مدد کر کے

☆ نیک مقاصد کے لیے سفر کی تیاری میں تعاون کر کے

مردوں کو بھی چاہیے ان معاملات میں سختی کی بجائے محبت سے اپنی خواتین سے مدد لیں اور تعاون پر ان کا شکریہ ادا کریں۔

انسان اور پانی

حفصہ فیصل

ٹھہری ہوئی جھیل میں مت رُکو، بلکہ دریا کی طرح بہتے رہو، بدلتے رہو، بدلتے رہو اور بدلتے رہو! کیونکہ پانی اگر جم جائے تو اس میں سڑانڈ پیدا ہو جاتی ہے اور جب بہتا ہے تو اپنے جوہر ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی، اپنی حقیقت کو تبھی پہچانتا ہے جب وہ حرکت کرتا ہے اور تبدیلی اختیار کرتا ہے۔

BAITUSSALAM OLYMPIAD'25
CELEBRATING THE SPIRIT OF UNITY
The City Tiles
Powered by FAV Group of Companies

احمد سلطان

9ویں بیت السلام اولمپیاڈ کی باوقار انعامی تقریب

بیت السلام یوتھ سوسائٹی کے تحت منعقد ہونے والے 9ویں بیت السلام اولمپیاڈ کی تقسیمِ انعامات کی انتہائی پروقار تقریب کراچی کے معروف اسپورٹس کلب معین خان اکیڈمی ڈی ایچ اے میں منعقد ہوئی، جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ تقریب کے مہمانانِ خصوصی میں شرعی عدالت کے جج جسٹس محمد انور، وزیراعلی سندھ کے مشیر طارق حسن، سابق چیف جسٹس عدالت عالیہ سندھ جسٹس نعمت اللہ پھلپھوٹو، قومی کرکٹ ٹیم کے وکٹ کیپر اسٹار بیٹسمین محمد رضوان، فاسٹ باؤلر حارث رؤف، ایڈیشنل آئی جی کراچی جاوید عالم اوڈھو اور معروف فنکار ایوب کھوسو شامل تھے۔

تقریب میں 6 سے 16 نومبر تک جاری رہنے والے نویں بیت السلام اولمپیاڈ میں کامیابی حاصل کرنے والے کھلاڑیوں میں انعامات تقسیم کیے گئے۔ تقریب سے خطاب میں ٹیسٹ کرکٹر محمد رضوان نے نوجوانوں کو کردار، اخلاق اور قومی ذمے داری کا واضح پیغام دیتے ہوئے کہا کہ "جب ہم غیر ملکی دوروں پر جاتے ہیں تو پاکستان کے سفیر ہوتے ہیں۔ ہمارا ہر رویہ، ہر عمل پاکستان کی نمائندگی کرتا ہے۔ نوجوان ہمارے مستقبل کا چہرہ ہیں اور ان پر بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خود کو سچا مسلمان اور اچھا پاکستانی ثابت کریں ان کا کہنا تھا کہ زندگی کے کسی بھی شعبے کسی بھی فیلڈ سے تعلق ہو ترجیح اسلام اور صرف اسلام ہونا چاہیے۔ اسٹار بیٹسمین محمد رضوان نے بیت السلام کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا بیت السلام کے ساتھ مالی جسمانی اور ہر قسم کا تعاون کرنے والے خیر کے کام میں حصہ لے رہے ہیں، کرکٹر حارث رؤف نے بھی اپنے مؤثر خطاب میں بیت السلام کی تعلیمی، رفاہی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ "یہاں دینی تعلیم کے ساتھ اسپورٹس کے ذریعے بھی بچوں کی تربیت کی جاتی ہے۔" انہوں نے کہا کہ بیت السلام کی سرگرمیاں اندرون و بیرون ملک تعلیمی میدان سے لے کر قدرتی آفات کے مواقع پر معاشرے کے لیے نمایاں مدد فراہم کرنے تک ہر ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ تقریب میں شریک مہمانوں نے بیت السلام یوتھ سوسائٹی کی کاوشوں کو سراہا اور نوجوان کھلاڑیوں کو بہترین کارکردگی پر مبارک باد پیش کی۔ شرعی عدالت کے جج جسٹس محمد انور اور جسٹس (ر) نعمت اللہ پھلپوٹو نے تقریب میں شرکت کی، پوزیشن ہولڈر طلبہ میں انعامات تقسیم کیے اور خطاب کیا، جسٹس محمد انور نے خطاب کرتے ہوئے کہا بیت السلام نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا کہ تعلیم خصوصا اعلی تعلیم پیسے کے بغیر ممکن نہیں یہاں غریب سے غریب بھی انتہائی اعلی تعلیم مفت حاصل کر رہا ہے۔ آخر میں بیت السلام کے سربراہ مولانا عبدالستار نے مہمانان گرامی انتظامیہ شرکاء کا شکریہ ادا کیا اور دعا کروائی۔

عالمی ادارہ بیت السلام ویلفیئر ٹرسٹ

BAITUSSALAM

سستی روٹی پراجیکٹ

لاکھوں روٹیاں مستحقین تک

5 روپیہ صرف عزت نفس کی خاطر

سپر فائن آٹا براہ راست بیت السلام ویئر ہاؤس بھی پہنچا سکتے ہیں کم سے کم 50 کلو

J.
FRAGRANCES
JANAN
Oud
JANAN
Oud
J.
www.junaidjamshed.com
J.Fragrances.Cosmetics
J.Fragrances.Cosmetics
J_Frag_Cos
J.JunaidJamshed